فہرست مضامین بیان القرآن ستائیسواں پارہ

خلاصہ مضامین	صفحہ نمبر
تمام مخلوق میں زوجیت کا قانون اور صداقت قرآنی پر ایک دلیل	2482
اللہ تعالیٰ سے تعلق کے بغیر کمال انسانی حاصل نہیں ہوتا	2483
منہ پھیر لینے سے مراد	2484
انسان کی پیدائش کی غرض	2484
﴿52﴾ سُوْرَةُ الطُّوْر	
تمہید سورت	2487
بیت معمور	2488
نیکوں کی ذریت	2491
کہانت کا ملک عرب سے نابود ہونا	2493
کہانت اور قرآن	2493
سپر یچوئلزم	2493
قرآن کی بے مثلی	2494
شیاطین کے آسمان سے اخبار غیبی لانے کی قطعی تردید	2495
علم غیب اور اس کا لکھنا	2496
جنگ بدر کی پیشگوئی	2497
﴿53﴾ سُوْرَةُ النَّجْم	
تمہید سورت	2499
نجم سے مراد	2499
آنحضرت ﷺ کی عصمت عملی اور اعتقادی دونوں پہلوؤں سے ثابت ہے	2500

خلاصہ مضامین	صفحہ نمبر
آپ ﷺ کا حرص ہوا سے خالی ہونا	2501
آنحضرت ﷺ کے جملہ قویٰ کا حالت اعتدال پر ہونا	2502
آنحضرت ﷺ کے جملہ قویٰ کا کمال کو پہنچنا	2503
آنحضرت ﷺ کا قرب اللہ تعالیٰ سے	2503
آنحضرت ﷺ کا قرب اللہ تعالیٰ سے تمام انسانوں پر فوقیت لے گیا	2504
معراج جسد عنصری سے نہ تھا	2505
آنحضرتؐ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا کس طرح تھا	2505
سدرۃ المنتہیٰ	2506
آنحضرتؐ کے علم کا انتہائے کمال کو پہنچ جانا	2507
معراج میں کیا دکھایا گیا	2807
لات۔عزیٰ۔منات	2508
غرانیق کا جھوٹا قصہ	2508
شفاعت کس کے لیے ہے	2510
تزکیہ نفس کا رستہ سعی ہے	2511
انسان کا زمین سے پیدا ہونا	2512
اصول سعی اور اس کا صحیح مفہوم	2513
میت کو ثواب	2513
علت العلل	2514
ساعت ہلاکت اعداء	2516
کفار کا سجدہ کرنا	2516

خلاصہ مضامین	صفحہ نمبر
﴿54﴾ سُوْرَةُ الْقَمَر	
تمہید سورت	2518
شق القمر پر روایات متواترہ	2518
قرب ساعت سے مراد	2519
اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے دوسرے معنی اور معجزہ کے نیچے حقیقت	2519
انشقاق قمر کا وقوع خلاف قانون قدرت نہیں	2519
انشقاق قمر اور خسوف	2520
ساعت وسطیٰ	2521
طوفان نوح میں التقاء ماء سے مراد	2522
لوح محفوظ	2522
حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور پانی کا قصہ	2525
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ بدر کو الساعۃ قرار دینا	2527
جنگ بدر کی پیشگوئی کی عظمت	2528
﴿55﴾ سُوْرَةُ الرَّحْمٰن	
تمہید سورت	2530
اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت	2531
ایک قانون کا نافذ کرنے والا ایک ہی خدا ہو سکتا ہے	2531
میزان اجرام سماوی	2531
میزان جو انسان کے لیے قائم کی گئی ہے	2531
مشرقین ومغربین	2533
دو سمندر	2534
سب مخلوق قانون فنا کے ماتحت ہے	2535
اللہ تعالیٰ کے شان میں ہونے سے مراد	2535

خلاصہ مضامین	صفحہ نمبر
شعلوں اور دھوئیں کی سزا	2537
قیامت میں نتائج اعمال کا ظہور	2538
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ کا تکرار	2538
اللہ کے خوف سے مراد	2539
مومن کے لیے دو بہشتوں کا وعدہ	2539
قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ سے کون مراد ہیں	2541
جنوں اور انسانوں کے تعلقات مناکحت	2541
کیا جن جنت میں جائیں گے	2542
مقربین اور اصحاب الیمین کے لیے جنت	2543
فتوحات ملکی کی طرف اشارہ	2543
﴿56﴾ سُوْرَةُ الْوَاقِعَة	
تمہید سورت	2546
پہلوں میں سابقین کیوں زیادہ ہیں	2548
صحابہ میں سے اولین مہاجرین کے کثیر حصہ کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا اور عیسائیت اور اہل تشیع پر اتمام حجت	2548
جنت میں اس دنیا کی عورتیں	2551
نعمائے جنت میں بقا اور سرور کا سامان	2551
مقربین اور اصحاب الیمین کی جنت میں فرق کا رنگ	2552
بعث بعد الموت میں یہ جسم نہیں	2554
بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ سے مراد	2556
قرآن کی عزت اور حفاظت	2557
لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ سے مراد	2558
﴿57﴾ سُوْرَةُ الْحَدِیْد	
تمہید سورت	2561

خلاصہ مضامین	صفحہ نمبر
الاول۔الاخر سے مراد	2562
الظاہر۔الباطن سے مراد	2562
مومنوں کو نور کس طرح مل سکتا ہے	2565
اعمال اور جزا کا تعلق	2565
بہشت اور دوزخ	2566
دوزخ بطور علاج	2566
مسلمانوں کی آئندہ حالت کا نقشہ	2567
دین کے لیے بھاگنے والوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونا	2568

خلاصہ مضامین	صفحہ نمبر
آخری زمانہ میں مصائب اہل اسلام	2570
شگون لینا جائز نہیں	2570
فراست حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا	2570
میزان عمل رسول ہے	2571
لوہے کا اتارنا	2571
بدعت رہبانیت	2572
اسلام میں بدعت کیا ہے	2573

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾

(ابراہیمؑ نے) کہا، اے رسولو! تمہارا اصل کام کیا ہے؟

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

انہوں نے کہا، ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾

تاکہ ان پر مٹی کے پتھر برسائیں۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾

(جن پر) تیرے رب کے ہاں حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے نشان کیے گئے ہیں۔ (3167)

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾

سو ہم نے ان کو جو اس میں مومن تھے نکال دیا۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾

پر ہم نے اس میں سوائے مسلموں کے ایک گھر کے اور کسی کو نہ پایا۔

وَ تَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾

اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لیے نشان چھوڑا جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

وَ فِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

اور موسیٰ میں (نشان ہے) جب ہم نے اسے فرعون کی طرف کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾

سو اس نے اپنی قوت پر سرتابی کی اور کہا (یہ) جادوگر ہے یا دیوانہ۔

فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾

سو ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا، پھر انہیں سمندر میں ڈالا اور وہ قابل ملامت تھا۔

3167- یعنی ان کا خطا کاروں پر بھیجا جانا مقدر تھا اور ﴿مُّسَوَّمَةً﴾ کے معنی مُرْسِلَةٌ بھی کیے گئے ہیں۔ اور اسی سے ہے ﴿فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ﴾ [النحل: 10:16] ''جن میں تم چراتے ہو۔'' ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً﴾ (ر) میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ آیت ﴿وَ تَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً﴾ [37] سے صاف ظاہر ہے۔

وَ فِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾

اور عاد میں (نشان ہے) جب ہم نے ان پر تباہ کرنے والی ہوا بھیجی۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾

وہ کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی، مگر اسے چورا کر دیتی تھی۔

وَ فِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾

اور ثمود میں (نشان ہے) جب انہیں کہا گیا ایک وقت تک فائدہ اٹھالو۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾

سو انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی، تو انہیں ایک ہولناک آواز نے آلیا اور وہ دیکھ رہے تھے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

پس نہ وہ اٹھنے کے قابل رہے اور نہ وہ بدلہ لے سکے۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور (اس سے پہلے نوح کی قوم (میں نشان تھا)۔ بیشک وہ نافرمان لوگ تھے۔

وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور آسمان کو ہم نے قوت کے ساتھ بنایا اور ہم وسیع قدرت والے ہیں۔ (3168)

3168- ﴿لَمُوْسِعُوْنَ﴾ وُسِعَ بمعنی قدرت سے ہے [دیکھو نمبر: 364] اور اَيْدٍ کے لیے [دیکھو نمبر: 2829] یہ يَدٌ کی جمع نہیں۔ اور پہلے آسمان اور زمین کا ذکر کر کے پھر فرمایا کہ ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں گویا اول **آسمان اور زمین کی زوجیت** کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے تو زمین میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے اور پھر عام کیا کہ دنیا میں ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ کھول کر فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ [یٰسٓ: 36:36] ''بے عیب (ذات) ہے جس نے سب جوڑے پیدا کیے اس سے جو زمین اگاتی ہے اور ان کی اپنی جانوں سے اور اس سے جو وہ نہیں جانتے۔'' یعنی نہ صرف نباتات میں جوڑے ہیں بلکہ اور مخلوق میں بھی جس

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور زمین کو ہم نے ہی بچھایا، سو ہم کیا خوب تیار کرنے والے ہیں۔

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾ ۚ

سو اللہ کی طرف دوڑو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں۔(3169)

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾ ۚ

اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود نہ بناؤ، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ ۚ

اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے کہا جادوگر ہے یا دیوانہ۔

کا ابھی انہیں علم بھی نہیں۔ یہ مخلوق وہی ہے جس کا علم آج خوردبین سے حاصل ہوا ہے۔ بلکہ شاید اور بھی کوئی ہو جس کا علم ابھی حاصل نہیں ہوا اور اس سب کا نتیجہ یہ بتایا کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو۔ جیسا کہ اگلی آیت میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔

3169- ﴿فَفِرُّوْٓا﴾ فَرَّ اور فِرَارٌ کے معنی بھاگنا ہیں اور ﴿اَیْنَ الْمَفَرُّ﴾ [القیامة: 10:75] ''کہاں بھاگ کر جانا ہے؟'' میں مَفَرَّ کے معنی بھی فِرَارٌ ہیں۔ (ل) اور مَفَرَّ کے معنی فرار کی جگہ یا فرار کا وقت بھی ہو سکتے ہیں۔

جس طرح ہر چیز کی ترقی اور اس کا نشوونما بغیر زوج کے نہیں ہوتا، اسی طرح انسان کی ترقی اور اس کی روح کا حقیقی نشوونما اللہ تعالیٰ سے تعلق کے بغیر نہیں ہوتا اور ﴿فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہی ہے [هُوَ تَمْثِیْلٌ لِلْاِعْتِصَامِ بِهٖ] (ر) یعنی اللہ تعالیٰ کو ہی تم اپنا محبوب و مقصود حقیقی بناؤ اور سب چیزوں کو چھوڑ کر اس کی طرف بھاگو۔ اس لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ اس کے ساتھ کسی کو اِلٰہ مت بناؤ یعنی کوئی تمہارا محبوب و مقصود سوائے باری تعالیٰ کے نہ ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو محبوب بھی بناؤ مگر ایسا محبوب کہ اس کے سوائے اور کوئی محبوب نہ ہو۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾

کیا ایک دوسرے کو وصیت کر رکھی ہے؟ بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں۔ (3170)

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾

سو ان سے منہ پھیر لے کیونکہ تجھ پر کوئی الزام نہیں۔ (3171)

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾

اور نصیحت کرتا رہ نصیحت مومنوں کو فائدہ دیتی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (3172)

3170- ﴿تَوَاصَوْا﴾ وَصِيَّةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 167] اور اَوْصٰی اور وَصّٰی اس سے فعل ہیں ﴿وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ﴾ [البقرة: 132:2] ''اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی۔'' ﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ﴾ [العنكبوت: 8:29] ''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکیدی حکم دیا ہے۔'' اور [تَوَاصَى الْقَوْمَ] ایک دوسرے کو وصیت کی۔ ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: 3:103] ''اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔'' (غ)

3171- **منہ پھیر لینے سے مراد:** اوپر چونکہ ذکر تھا کہ ساحر و مجنون کہتے ہیں اور یہ ان کی ایذاؤں کی طرف اشارہ ہے جو وہ نبی کریم ﷺ کو استہزا کر کے پہنچاتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ ان سے منہ پھیر لو یعنی ان کے اس استہزا وغیرہ کی کچھ پروانہ کرو، یہ ہجرت کا حکم نہیں۔ البتہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول پر بعض صحابہ کو یہ خیال گزرا کہ اب قریش پر عذاب نازل ہوگا۔ ﴿فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ﴾ گو یہاں صرف اس غرض کے لیے لایا گیا ہے کہ معاملہ تبلیغ میں آپ نے کوئی کمی نہیں کی مگر الفاظ عام ہیں اور صاف بتاتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کسی قسم کی ملامت کے نیچے نہ تھے۔ یہ بھی آپ کی عصمت پر دلیل ہے۔

3172- **انسان کی پیدائش کی غرض:** جن اور انسان کی پیدائش کی اصل غرض بتائی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود بنائیں۔ بالفاظ دیگر بتایا کہ انسان اپنے کمال کو صرف عبادت الٰہی سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں کہا کہ میں ان سے رزق یا کھانا طلب نہیں کرتا، یعنی ان کی عبادت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کیونکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ اور یوں سمجھایا کہ عبادت کی غرض صرف اپنی تکمیل ہے اور وہ کمال صرف عبادت الٰہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جنوں اور انسانوں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہی نافرمانی کرتے ہیں، ملائکہ نافرمانی نہیں کرتے۔ یا اس لیے کہ وہ عبادت کے لیے مسخر ہیں اور یہاں اس عبادت کا ذکر ہے جو اختیار سے ہے۔ اس لیے صرف جنوں اور انسانوں کا ذکر کیا۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾

میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا دیں۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾

اللہ ہی رزق دینے والا، قوت والا، زبردست ہے۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾

سو ان کے لیے جو ظلم کرتے ہیں مقرر پیمانہ ہے۔ جیسے ان کے ساتھیوں کا مقرر پیمانہ تھا۔ سو وہ مجھ سے جلدی نہ کریں۔ (3173)

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع 3/14/2

پس افسوس ان پر جو کافر ہیں، اس دن سے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ (3173) ل

3173- ﴿ذَنُوْبٍ﴾ ذَنَبٌ جانور کی دم کو کہتے ہیں اور ذَنُوْبٌ لمبی دم والے گھوڑے کو کہتے ہیں اور استعارۃً نصیب یعنی حصہ یا بہرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے سَجْلٌ کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ذَنْبٌ کی جمع ذُنُوْبٌ ہے۔ (غ) اور [يَوْمَ ذَنُوْبٌ] اس دن کو کہتے ہیں جس کی شر لمبی ہو اور ذَنُوْبٌ اس ڈول کو کہتے ہیں جس میں پانی ہو۔ حدیث میں ہے [اَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ مِنْ مَاءٍ، فَأُهْرِيقَ عَلَيْهِ] (صحيح البخاری، كتاب الوضوء، باب: يُهَرِيقُ الْمَاءَ عَلَى الْبَوْلِ، حديث: 221م) (ل) یعنی آپ نے پانی کا ایک ڈول لانے کا حکم دیا اور وہ اس پر بہا دیا گیا۔

3173ل- ﴿لِلَّذِيْنَ﴾ ل کئی طرح پر آتا ہے۔ فعل کو دوسرے پر وارد کرنے کے لیے جیسے ﴿تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾ [الصافات: 103:37] ''اسے ماتھے کے بل لٹایا'' کے لیے، جیسے مَلِك کے لیے جیسے ﴿وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [آل عمران: 189:3] ''اور زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔''، استحقاق کے لیے جیسے ﴿لَهُمُ اللَّعْنَةُ﴾ اور یہاں بعض کے نزدیک بمعنی عَلٰی ہے اور ﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا﴾ [الزلزال: 5:99] ''کیونکہ تیرے رب نے اس کے لیے وحی کی۔'' میں بعض نے لام کو بمعنی اِلٰی لیا ہے مگر یہ اس بات پر تنبیہ کے لیے ہے کہ یہ وحی تسخیر سے ہے اور انبیاء کی وحی کی طرح نہیں۔ اور اَجل کے معنی ہیں جیسے ﴿لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ [النسآء: 105:4] ''دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا'' اور لام ابتدا کے لیے بھی آتا ہے جیسے ﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى﴾ [التوبة: 108:9] ''یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔'' ﴿لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا﴾ [یوسف: 8:12] ''یوسف اور اس کا بھائی تو ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں۔'' ﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً﴾ [الحشر: 13:59] ''تمہارا ڈر بہت زیادہ ہے۔'' اور اِنَّ کے ساتھ کبھی اس کے اسم میں اور کبھی اس کی خبر میں جیسے

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً﴾ [النازعات: 26:79] ''اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے۔'' ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ [الفجر: 14:89] ''بے شک تیرا رب گھات میں ہے۔'' ﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ﴾ [هود: 75:11] ''یقیناً ابراہیم بردبار، نرم دل تھا۔'' اور لام قسم جیسے ﴿لَعَمْرُكَ﴾ [الحجر: 72:15] ''تیری زندگی کی قسم!'' اور لَوْ کی خبر میں آتا جیسے ﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ﴾ [البقرة: 103:2] ''اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقوی کرتے تو بدلہ بہتر تھا۔'' ﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ [الفتح: 25:48] ''اگر وہ الگ ہوجاتے جو کافر تھے ہم انہیں دردناک عذاب دیتے۔'' اور لام مکسورہ ابتدا کے لیے آتا ہے۔ ﴿لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ﴾ [النور: 58:24] ''جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں۔'' ﴿لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ﴾ [الزخرف: 77:43] ''تیرا رب ہمارا کام تمام کردے۔'' نیز [دیکھو نمبر: 549] تعلیل کے لیے [نمبر: 562] بمعنی اِلٰی [نمبر: 497] انتفاع کے لیے [نمبر: 573] عاقبت کے لیے۔ اَلَّذِیْنَ۔ اَلَّذِیْ اسم موصول ہے تثنیہ اَللَّذَانِ۔ جمع اَلَّذِیْنَ، مؤنث اَلَّتِیْ اور جمع مؤنث کے لیے اَللّٰتِیْ اور اَللّٰائِیْ۔

اٰیَاتُهَا 49 (52) سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ (76) رُكُوْعَاتُهَا 2

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ — طور گواہ ہے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ — اور لکھی ہوئی کتاب۔

فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ — پھیلے ہوئے ورقوں میں۔

وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ — اور آباد گھر۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ — اور اونچی چھت۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ — اور بھرا ہوا دریا۔ (3174)

سورۃ الطور

نام:

اس سورت کا نام اَلطُّوْرِ ہے اور اس میں 2 رکوع اور 49 آیتیں ہیں۔ لفظ طُوْر میں اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی طرف ہے جس کا نزول طور پر ہوا۔ اور مقصود اس نام میں یہ ہے جیسا کہ سورت کی ابتدائی آیات میں وضاحت کردی ہے کہ جس طرح اس وحی کی مخالفت کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہوا ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی مخالفت کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہوگا اور یہی مضمون اس سورت کا ہے۔ بلکہ آخری آیات میں جنگ بدر کی طرف اشارہ بھی کردیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی قوت کو توڑنے کا موجب ہوئی۔ پچھلی سورت میں حق کی تدریجی ترقی کا ذکر تھا تو یہاں مخالفت کرنے والوں کی سزا کا ذکر کیا۔ اس کا نزول بھی ابتدائے مکی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

3174- ﴿رَقٍّ﴾ رِقَّةٌ وہ باریکی ہے جو بلحاظ عمق ہو اور کبھی اجسام میں ہوتی ہے اور کبھی نفس میں قساوت کے مقابل پر جیسے رقیق القلب اور ﴿رَقٍّ﴾ کاغذ کی طرح ہے جس پر لکھا جاتا ہے۔ (غ) یعنی کھال جس پر لکھا جاتا ہے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ تیرے رب کا عذاب آ کر رہے گا۔

مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ اسے کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔

﴿الْمَسْجُوْرِ﴾ [دیکھو نمبر: 2920] اور [سَجَرْتُ النَّهْرَ] کے معنی ہیں میں نے دریا کو بھر دیا اور ﴿وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝﴾ [التکویر: 6:81] ''اور جب دریا خشک کر دیئے جائیں گے۔'' میں ثعلب نے معنی کیے ہیں بھر دیئے جائیں گے۔ ﴿الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ﴾ اور کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ سمندر کو آگ لگا دی جائے گی۔ پس وہ نار جہنم ہو جائے گا۔ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے آگ سے بھرا ہوا اور مَسْجُوْرٌ کے معنی کلام عرب میں مَمْلُوْ ہیں یعنی بھرا ہوا۔ اور [سَكَرْتِ الْاِنَاءَ] اور سَجَرْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے بھر دیا۔ اور ﴿وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝﴾ میں یہ معنی بھی کیے گئے ہیں یعنی بعض بعض میں ملا کر سب ایک کر دیئے جائیں اور مَسْجُوْرٌ کے معنی ساکن اور خالی بھی آئے ہیں۔ (ل)

طُوْر سے مراد اس نام کا پہاڑ بھی لیا گیا ہے اور مطلق پہاڑ بھی۔ اور ﴿كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝﴾ سے مراد توریت بھی لی گئی ہے اور توریت، زبور، انجیل بھی اور قرآن بھی اور لوح محفوظ بھی۔ اور ﴿الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝﴾ سے مراد وہ گھر لیا گیا ہے جو خانہ کعبہ کے مقابل پر آسمان میں ہے۔ اور حسن نے کہا کہ یہ کعبہ ہے اور ﴿السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝﴾ سے مراد آسمان بھی لیا گیا ہے۔ اور ﴿الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝﴾ سے مراد بھرا ہوا یا خشک یا آگ لگا ہوا در یا لیا گیا ہے۔ اور ان سب چیزوں کو اس بات پر گواہ ٹھہرایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب مکذبین پر یقیناً آ کر رہے گا۔ گویا گزشتہ واقعہ کو بطور شہادت پیش کیا ہے اور اس صورت میں طُوْر سے مراد وہ پہاڑ ہونا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی اور آپ کو شریعت دی گئی اور کتاب سے مراد توریت ہونا اور بحر سے مراد وہ دریا ہونا جو بنی اسرائیل کے لیے خشک ہو گیا اور فرعون کے لیے بھر کر غرق کرنے کا موجب ہو گیا۔ لیکن اس صورت میں ﴿الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝﴾ کا تعلق بظاہر نظر نہیں آتا۔ جب تک کہ اس سے بیت المقدس یا وہ گھر مراد نہ لیا جائے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عبادت کے لیے قائم کیا۔ لیکن قرآن کریم نے لفظ ایسے اختیار کیے ہیں جو ایک طرف اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق صادق آتے ہیں تو دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی صادق آتے ہیں۔ یعنی آپ پر بھی ایک پہاڑ پر نزول وحی ہوا اور آپ کو بھی ایک کتاب دی گئی جو کھالوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھی۔ اور آپ کو بھی ایک بیت معمور یعنی خانہ کعبہ دیا گیا اور آپ کے دشمن بھی آپ کے مقابلہ میں تباہ ہوئے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمن تباہ ہوئے۔ وہ اگر دریا میں غرق ہوئے تو یہ خشکی پر غرق ہوئے اور بحر کا لفظ دونوں پر صادق آتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 2597] اور ﴿السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝﴾ میں مراد آسمان بھی ہو سکتا ہے اور بیت معمور کی بلند چھت بھی ہو سکتی ہے اور ﴿الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝﴾ کا خانہ کعبہ کے مقابل پر آسمان پر یا ایک بیت معمور کا ہر آسمان پر ہونا خود اس بات کو چاہتا ہے کہ خانہ کعبہ بھی ﴿الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝﴾ ہی ہے۔ جیسا کہ حسن سے روایت ہے۔ (ر) اور گو یہ لفظ دوسرے قبیلوں پر بھی بولا گیا ہو مگر حقیقتاً خانہ کعبہ پر بھی صادق آتا ہے، جس کی زیارت تا قیامت ہوتی رہے گی۔

يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾	جس دن آسمان جنبش میں ہوگا۔ (3174)ل
وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾	اور پہاڑ اڑائے جائیں گے۔
فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾	تو اس دن جھٹلانے والوں کے لیے افسوس ہے۔
وقف لازم الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾	جو (عبث) باتوں میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں۔
يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾	جس دن دھکے دے کر دوزخ کی آگ کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ (3175)
هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾	یہ وہ آگ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔
اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ﴿۱۵﴾	تو کیا یہ جادو ہے یا کیا تم دیکھتے نہیں۔

3174ل- ﴿تَمُوْرُ﴾ مَارَ [يَمُوْرُ مَوْرًا] ایک چیز حرکت میں آئی یا آئی اور گئی۔ اور صحاح میں ﴿تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴾ کے معنی کیے ہیں [تَمُوْجُ مَوْجًا] اور [مَارَ الشَّيْءُ] ایک چیز مضطرب اور متحرک ہوئی۔ اور مَارَ پانی یا خون یا آنسوؤں کے بہنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ل) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے ﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ﴾ (ج) تو اس صورت میں مراد وہی ہوگی جو ﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ﴾ [الفرقان: 25:25] ''جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا۔'' میں مراد ہے۔ [دیکھو نمبر: 2367] اور یوں بھی جس عذاب کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے وہ اولاً عذاب دنیا ہی ہے اور بعدہ عذاب آخرت۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل پر جس عذاب کا ذکر ہے وہ بحر مسجور کا عذاب ہے۔ یعنی فرعون کا سمندر میں غرق ہونا، جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرقان قرار دیا گیا۔ اور اس کے بالمقابل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرقان بدر ہے جیسا کہ سورت کی آخری آیات سے ظاہر ہے۔ ﴿اِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا﴾ [44 تا 47] اور یہ عذاب دنیا ہے نہ عذاب آخرت اور ﴿تَسِيْرُ الْجِبَالُ﴾ پر [دیکھو نمبر: 1623] و [نمبر: 2101]۔

3175- ﴿يُدَعُّوْنَ﴾ دَعٌّ سختی کے ساتھ دور کرنا ہے۔ ﴿الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ﴾ [الماعون: 107:2] ''جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔'' (غ) یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس عذاب کا پہلی آیات میں ذکر ہے وہ عذاب دنیا ہے اور اس کے بعد پھر وہ عذاب جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اس میں داخل ہو جاؤ، پھر صبر کرو یا صبر نہ کرو، تمہارے لیے برابر ہے۔ تمہیں صرف اسی کا بدلہ دیا جاتا ہے جو تم کرتے تھے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾

متقی باغوں اور نعمتوں میں ہیں۔

فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾

اپنے رب کے دیئے پر خوش ہوں گے اور ان کے رب نے انہیں جلتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچایا۔

كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

خوشگواری سے کھاؤ اور پیو، بدلہ اس کا جو تم کرتے تھے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾

برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے ہوئے اور ہم انہیں خوبصورت حوروں کا ساتھی بنا دیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾

اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل سے ہم کچھ کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اپنی کمائی میں گرو ہے۔ (3176)

3176- ﴿اَلْحَقْنَا﴾ لَحِقْتُهٗ اور [لَحِقْتُ بِهٖ] کے معنی ہیں میں نے اسے پالیا ﴿لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ [آل عمران: 170:3] ''جو ان کے پیچھے سے انہیں نہیں ملے۔'' ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ [الجمعة: 3:62] ''اور ان میں سے اوروں کو بھی جو ابھی ان کو نہیں ملے۔'' اور [اَلْحَقْتُ بِهٖ كَذَا] اسے دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ (غ)

﴿اَلَتْنٰهُمْ﴾ اَلَتَ۔ اَلَتَ کے معنی خَلَفَ ہیں اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ کو کہا [اِتَّقِ اللّٰهَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ] تو دوسرے آدمی نے جو سن رہا تھا کہا [اَقَالَتْ عَلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ] تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا

وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾ اور ہم انہیں پھل اور گوشت میں جس سے وہ چاہیں، پے بہ پے دیں گے۔

اسے چھوڑ دے۔ قوم کا بھلا اسی وقت تک ہے جب تک یہ ایسی باتیں ہمیں کہتے رہیں۔ اور قَالَتْ کے معنی یہاں کیے گئے ہیں امیر المومنین کی ہتک کرتا ہے اور یا ان کے مقام کو گراتا ہے۔ اور [اَلَتْهُ مَالَهٗ وَ حَقَّهٗ] کے معنی ہیں اس کا مال اور حق کم کر کے دیا۔ گویا اَلَاتَ [دیکھو نمبر: 2819] اور اَلَتَ کے ایک ہی معنی ہیں۔ (ل)

﴿امْرِئٍ﴾ مَرْءٌ انسان کو کہتے ہیں اور اِمْرَءٌ اور اِمْرَأَةٌ عورت کو ﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ﴾ [النسآء: 176:4] ''اگر کوئی شخص مر جائے۔'' اور [مُرُوَّةُ مَرْءٍ] یعنی انسان کا کمال یہ ہے۔ (غ)

﴿رَهِيْنٌ﴾ رَهْنٌ وہ ہے جو قرضہ کے لیے اعتماد کے طور پر رکھا جائے اور ﴿رَهِيْنٌ﴾ اور ﴿رَهِيْنَةٌ﴾۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾﴾ [المدثر: 38:74] ''ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا گرفتار (بلا) ہوگا'' میں دو قول ہیں۔ یعنی فعیل بمعنی فاعل یا ثابت کھڑا ہونے والا اور یا فعیل بمعنی مفعول یعنی ہر ایک نفس اس کی جزا میں کھڑا کیا جائے گا جو اس نے عمل کر کے آگے بھیجا۔ ہے اور چونکہ رہن سے ایک چیز کا حبس یعنی روک رکھنا مقصود ہے اس لیے استعارۃً یہ لفظ روک رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (غ) مراد اس سے یہ لی گئی ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مومن کی ذریت کو گو اس نے اعمال کے لحاظ سے وہ کمال حاصل نہ کیا ہو جنت میں وہی درجہ مل جائے گا جو اعلیٰ درجہ کے مومنوں کو ملے گا۔ اور بعض نے دوسری ذریت سے مراد چھوٹے بچے لیے ہیں۔ مگر آیت کے آخری الفاظ ﴿كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ سے اشارہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسری جگہ یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾﴾ [المدثر: 38-39:74] ''ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا گرفتار (بلا) ہوگا۔ سوائے دائیں ہاتھ والوں کے۔'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی کرتوتوں کی وجہ سے گرفتار بلا ہوں گے۔ تو پس یہاں اصل بات جس کا ظاہر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ محض نسب سے کچھ فائدہ حاصل نہیں۔ نیک لوگوں کی اولاد ان نیکوں کے ساتھ اگر ملے گی تو اس شرط پر کہ [اتَّبَعَتْهُمْ بِاِيْمَانٍ] کی مصداق ہو، یعنی ایمان میں ان کا اتباع کرے اور جو ایمان میں نیکوں کا اتباع نہیں کرتے وہ نیکوں کی ذریت ہونے کی وجہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ کیونکہ یہاں ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے۔ ہاں ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ایمان میں اتباع ہو اور اعمال اس کمال کو نہ پہنچ سکیں، جس کمال کو اس پہلی نسل کے اعمال پہنچے ہیں جنہوں نے خطرناک تکالیف اٹھا کر حق کو قبول کیا ہے تو اس کمی کی وجہ سے وہ پیچھے نہیں رہیں گے۔ بلکہ اپنے باپ دادوں کے ساتھ ہوں گے۔ اور ﴿مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ﴾ میں شاید اسی طرف اشارہ ہے اور یا یہ عام ہے کہ کسی کا عمل بھی ہم کبھی کم نہیں کرتے۔

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَ لَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾

وہ اس میں ایک دوسرے سے وہ پیالہ لیں گے جس میں نہ لغو ہے اور نہ گناہ۔ (3177)

وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾

اور ان کے آس پاس ان کے غلام پھرتے ہوں گے۔ گویا کہ وہ پردے میں رکھے ہوئے موتی ہیں۔ (3178)

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

کہیں گے ہم پہلے اپنے اہل میں ڈرنے والے تھے۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

سو اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں لُو کے عذاب سے بچالیا۔

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾ ع 1/28/3

ہم پہلے اسے پکارتے تھے۔ وہ بڑا احسان کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

3177- ﴿يَتَنَازَعُوْنَ﴾ تَنَازِعَ کے لیے [دیکھو نمبر: 539] اور [نَازَ عَنِيْ فُلَانٌ بِنَالَهُ] کے معنی ہیں مصافحہ کیا۔ اور مَنَازِعَةٌ مصافحہ ہے۔ اور [مُنَازَعَةُ الْكَأْسِ] سے مراد پیالہ کا ایک دوسرے کو دینا یا ایک دوسرے سے لینا ہے۔ (ل)

3178- ﴿غِلْمَانٌ﴾ غُلَامٌ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 416] و [نمبر: 1947]۔ ﴿لُؤْلُؤٌ﴾ موتی۔ ﴿غِلْمَانٌ﴾ سے مراد یہاں خادم ہیں۔ (ج) اور بعض نے مراد ان کی اولاد لی ہے جو ان سے پہلے گزر چکی۔ (ر) صورت اول میں یہ نعمائے بہشتی میں سے ایک نعمت ہے اور جیسے یہاں ان خدام کو موتی کہا ہے دوسری جگہ ان ساتھیوں کو جنہیں حور کہا ہے یاقوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ یہ اس دنیا کی چیزیں نہیں۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّ لَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾

سو نصیحت کرتا رہ کہ تو اپنے رب کی نعمت سے کاہن نہیں اور نہ ہی دیوانہ ہے۔ (3179)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾

بلکہ کہتے ہیں کہ شاعر ہے۔ ہم اس کے لیے زمانہ کی گردش کا انتظار کرتے ہیں۔ (3180)

3179- ﴿بِكَاهِنٍ﴾۔ **كَاهِنٍ** وہ ہے جو ایک قسم کے ظن سے گذری ہوئی مخفی خبریں بتاتا ہے اور **عَرَّاف** وہ ہے جو آئندہ کی خبریں دیتا ہے اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کاہن یا عراف کے پاس جاتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر اس کی تصدیق کرتا ہے تو اس سے کفر کرتا ہے جو ابی القاسم پر نازل ہوا۔ (غ) اور حدیث میں جو **كَاهِنٍ** کا ذکر آتا ہے تو ابن اثیر نے لکھا ہے کہ وہ وہ ہے جو آئندہ زمانہ ہونے والے چیزوں کی خبر دیتا ہے اور چھپی ہوئی باتوں کے جاننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور عرب کے لوگ کاہن تھے جیسے شق اور سطیح وغیرہ۔ بعض ان میں گمان کرتے تھے کہ ان کا کوئی جن تابع ہے جو انہیں خبریں پہنچاتا ہے۔ اور بعض کا ان میں سے خیال تھا کہ وہ سائل کے کلام اور فعل اور حال وغیرہ پر غور کر کے ایسی باتوں کا استدلال کر لیتا ہے جن سے وہ امور غیبی کو معلوم کر سکتا ہے اور ایسے لوگوں کو **عَرَّاف** کے نام سے مخصوص کرتے تھے۔ اور ازہری کا قول ہے کہ کہانت ملک عرب میں ہمارے نبی ﷺ کی بعثت سے پیشتر موجود تھی۔ لیکن آپ کی تشریف آوری سے **کہانت کا علم باطل ہو گیا** اور کاہنوں کے اباطیل فرقان کے سامنے اٹھ گئے اور اب کہانت باقی نہیں رہی۔ اور کاہن لوگ اپنے باطل قولوں کو مسجع کر کے پیش کرتے تھے جس سے لوگوں کے دلوں پر خاص اثر پڑتا تھا اور ان کے دل اور کان ان کی طرف مائل ہوتے تھے۔ (ل)

کہانت اور قرآن:

اعدائے حق نے جو پیرائے آنحضرت ﷺ کو بدنام کرنے کے لیے اختیار کیے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگوں کو کہتے رہتے تھے کہ آپ کاہن ہیں اس کی اللہ تعالیٰ نے یہاں نفی کی ہے اور جس شخص کو عربی زبان سے ادنیٰ واقفیت بھی ہے اس نے کاہنوں کے کلام کو دیکھا ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ کاہنوں کے کلام اور فرقان حمید میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کاہنوں کا کلام صرف ایک ظنی بات کو ذو معنی پیرایہ میں بیان کرنے کے لیے مسجع کیا جاتا تھا اس میں کوئی صداقت، کوئی اخلاق، کوئی اصول نہیں ہوتے تھے۔ بالمقابل قرآن کریم ایک نہایت پاکیزہ کلام ہے جس میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور روحانیت کے اصول اور اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کاملہ پر اعلیٰ درجہ کی دلائل بیان ہوئی ہیں اور قرآن کریم نے تو کہانت کو دنیا سے نابود کیا۔ آج کل کی اس تحریک میں جو **سپر چوئلزم** کے نام سے موسوم ہے کہانت کا بیشتر رنگ پایا جاتا ہے اور اس کو بھی صرف قرآن شریف ہی دور کر سکتا ہے۔ عیسائیت نے اس بیماری کو یورپ میں پیدا کیا ہے اور اس کا علاج اسلام میں ہے۔

3180- ﴿رَيْبَ﴾ ﴿رَيْبَ الْمَنُوْنِ﴾ میں (حوادث کو) **رَيْب** کہا ہے، نہ اس لیے کہ اس کے وقوع میں شک ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے

قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ﴿۳۱﴾

کہہ، انتظار کرو کہ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَاۤ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾

کیا ان کی عقلیں انہیں یہ حکم دیتی ہیں؟ بلکہ وہ سرکش لوگ ہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

کیا کہتے ہیں یہ جھوٹ بنالیا ہے۔ بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ (3181)

فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ﴿۳۴﴾

تو اس جیسی کوئی بات لائیں، اگر سچے ہیں۔ (3182)

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

کیا یہ بغیر کسی کے (پیدا کرنے کے) پیدا ہو گئے ہیں یا یہی پیدا کرنے والے ہیں۔ (3183)

وقت حصول میں شک ہے۔ (غ) اور رَیْبٌ زمانہ کی گردش کو بھی کہتے ہیں۔ اور حدیث فاطمہؓ میں ہے [یَرِیْبُنِیْ مَا رَابَهَا] (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب: ذَبِّ الرَّجُلِ عَنِ ابْنَتِهٖ فِی الْغَیْرَةِ وَالإِنْصَافِ، حدیث: 5230) یعنی جس بات سے اسے تکلیف پہنچتی ہے مجھے بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ اور [رَابَنِیْ هٰذَا الْاَمْرُ] کہا جاتا ہے جب کوئی ایسا امر ہو جسے تم ناپسند کرتے ہو اور [رَیْبَ الدَّهْرِ] زمانہ کی گردشیں اور اس کے حوادث ہیں اور ﴿رَیْبَ الْمَنُوْنِ﴾ حوادث دہر ہیں۔ (ل)

﴿الْمَنُوْنِ﴾ مَنٌّ کے معنی قطع کرنا ہیں۔ اور ﴿الْمَنُوْنِ﴾ موت ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو قطع کر دیتی ہے۔ اور بعض کے نزدیک ﴿الْمَنُوْنِ﴾ دہر یعنی زمانہ ہے۔ (ل)

3181- ﴿تَقَوَّلَ﴾ [تَقَوَّلُوْ قَوْلًا] کے معنی ہیں خود جھوٹ بنالیا اور [تَقَوَّلَ عَلَیَّ] مجھ پر جھوٹ بولا اور وہ بات میری طرف منسوب کی جو میں نے نہیں کہی۔ ﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾﴾ [الحاقة: 44:69] ''اور اگر وہ ہم پر بعض باتیں افترا کے طور پر بنالیتا۔'' (ل)

3182- اس ابتدائی زمانہ میں بھی قرآن کے کلام بے مثل ہونے کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

3183- ﴿خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ﴾ [مِنْ غَیْرِ مُقَدَّرٍ وَ خَالِقٍ] (ر) یعنی بغیر کسی اندازہ کرنے والے اور خالق کے خود بخود ہو گئے

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾

یاانہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ یقین نہیں کرتے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

کیا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا یہ مسلط ہیں؟(3184)

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

کیا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہے جس سے سن لیتے ہیں۔ تو چاہئے کہ ان کا سننے والا کوئی کھلی دلیل لائے۔(3185)

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَ لَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾

کیا اس کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے ہیں؟

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾

کیا تو ان سے اجر مانگتا ہے۔ تو یہ چٹی کے بوجھ میں دبے ہوئے ہیں۔

ہیں۔ ﴿اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ یعنی اپنے خالق آپ ہیں۔ اور اگر یہ اپنے خالق ہیں تو کیا آسمانوں اور زمین کو بھی انہوں نے ہی پیدا کیا ہے، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ اور ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ﴾ کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ کیا بغیر کسی علت و غایت کے پیدا کیے گئے ہیں؟

3184- ﴿الْمُصَيْطِرُوْنَ﴾ مُصَيْطِرٌ۔ سَطْرٌ ایک صف ہے، لکھی ہوئی چیز کی ہو یا درختوں یا کھڑے ہوئے ہوئے لوگوں کی۔ اور [تَسَيْطَرُ فُلَانٌ عَلٰى كَذَا] اور [سَيْطَرُ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں کہ اس پر ایک سطر کی طرح قائم ہوگیا۔ اور مُصَيْطِرٌ سے مراد وہی ہے جو ﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ﴾ [الرعد: 33:13] ''پھر کیا وہ جو ہر شخص پر کھڑا ہے'' میں قائم ہے اور ﴿مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ﴾ [الأنعام: 104:6] ''میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔'' سے مراد ہے (غ) اور مُسَيْطِرٌ اور مُصَيْطِرٌ وہ ہے جسے کسی چیز پر مسلط کر دیا جائے تا کہ وہ اس پر بلند ہو اور اس کے احوال کا تعہد کرے اور اس کے عمل کو لکھے اور اس کا اصل سَطْرٌ ہے۔ اور یہاں مُصَيْطِرٌ کے معنی مسلط ہی ہیں اور طا کی وجہ سے س صاد سے بدل گیا ہے۔ (ل) مطلب یہ ہے کہ نہ ان کے پاس الٰہی خزانے ہیں نہ انہیں چیزوں پر تسلط دیا گیا ہے۔

3185- ثیا **طین کے آسمان سے اخبار غیبی لانے کی قطعی تردید:** ﴿سُلَّمٌ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 935] مراد کوئی ذریعہ یا سبب ہے۔ یہ آیت اس خیال کی کلی نفی کرتی ہے کہ شیاطین آسمان پر چڑھ کر کچھ غیب کی باتیں سن لیتے ہیں جنہیں کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اسی بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر یہ کچھ سنتے ہیں تو پیش کریں۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾

کیاان کے پاس غیب ہے؟ تو وہ لکھ لیتے ہیں۔ (3186)

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾

کیا یہ کوئی داؤ کرنا چاہتے ہیں؟ تو جو کافر ہیں وہی داؤ کے نیچے آتے ہیں۔ (3187)

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾

کیاان کے لیے سوائے اللہ کے کوئی معبود ہے۔ اللہ اس سے پاک ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔

وَ اِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾

اور اگر یہ آسمان سے (عذاب کا) کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں، کہیں گے تہ بتہ بادل ہیں۔ (3188)

3186- یعنی ان کے پاس کوئی ایسا علم غیب نہیں جس پر انہیں اس قدر وثوق ہو کہ وہ اسے لکھ لیں۔ زبانی بعض باتیں کہہ دیتے تھے، اگر جھوٹ نکلا تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس غیب پر جس کا آپ نے اظہار کیا کس قدر وثوق تھا کہ ہر ایک آیت نزول کے ساتھ لکھ بھی لی جاتی تھی اور علاوہ ازیں حفظ بھی کر لی جاتی تھی۔

3187- ﴿اَلْمَكِيْدُوْنَ﴾ [اَلَّذِيْنَ يَحِيْقُ بِهِمْ كَيْدَهُمْ وَ يَعُوْدُ عَلَيْهِمْ وَ بَالُهٗ] (ر) اور کید ہر تدبیر کو کہتے ہیں [اَلتَّدْبِيْرُ بِبَاطِلٍ اَوْ حَقٍّ] (ل) یعنی خواہ باطل تدبیر ہو اور خواہ حق۔ نیز [دیکھو نمبر: 507]

3188- ﴿سَاقِطًا﴾ سُقُوْطٌ ایک بلند مکان سے پست مکان کی طرف گرنا ہے اور اسی معنی میں ہے ﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ [التوبة: 49:9] ''دیکھو دکھ میں تو یہ پڑ ہی گئے۔'' اور ایک سقوط یہ ہے کہ جو چیز سیدھی کھڑی ہے وہ گر جائے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس پر بڑھاپا آجائے اور وہ بڑی ہو جائے۔ (غ) اور [سُقِطَ اِلَى الْقَوْمِ] کے معنی ہیں [نَزَلُوْا عَلَيْ] (یعنی سقوط بمعنی نزول ہے) اور حدیث میں ہے [عَلَى الْخَبِيْرِ سَقَطْتَ] (صحيح مسلم، كتاب الحيض، باب: نَسْخِ الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ· وَوُجُوْبِ الْغُسْلِ بِالْتِقَاءِ الْخِتَانَيْنِ، حديث: 812) جس سے مراد یہ ہے کہ تو ایک باخبر آدمی کے پاس آ گیا ہے۔ (ل) آسمان سے کسی ٹکڑے کے گرنے سے کیا مراد ہے؟ [دیکھو نمبر: 1877] کفار بار بار اس رنگ میں عذاب کا مطالبہ کرتے تھے ﴿فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [الشعرآء: 187:26] ''سو ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرا دے۔'' ﴿اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾ [بنی إسرائيل: 92:17] ''یا تو آسمان کو جیسا کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے۔'' اور كِسْفٌ اس لحاظ سے کہا کہ وہ عذاب کا ایک ٹکڑا یا حصہ ہے۔ اور ﴿سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ﴾ کہنے سے یہ منشا ہے کہ عذاب کے آنے سے پہلے وہ ان حالات کو جن سے عذاب پیدا ہوتا ہے اپنی بہتری کا موجب سمجھتے ہیں۔ قومیں جب حق کی مخالفت میں مست ہوتی ہیں تو وہ انہی چیزوں

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾

سو انہیں چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو ملیں جس میں ہلاک کیے جائیں گے۔ (3189)

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾

جس دن ان کا داؤ ان کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ انہیں مدد دی جائے گی۔

وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور ان کے لیے جو ظالم ہیں اس کے سوائے ایک اور عذاب ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (3190)

کو جوان کے لیے انجام کار دکھوں کا موجب بنتی ہیں سکھ کا موجب سمجھتی ہیں۔

3189- ﴿يُصْعَقُوْنَ﴾ [صَعِقَ الْاِنْسَانَ] کے معنی ہیں وہ بے ہوش ہو کر گر گیا اور اس کی عقل جاتی رہی یا وہ مر گیا۔ اور صُعِقَ کے معنی ہیں اسے صاعقہ نے آلیا اور صَاعِقَةٌ وہ آگ بھی ہے جو رعد کے ساتھ آسمان سے اترتی ہے۔ اور [صَيْحَةَ الْعَذَابِ] کو بھی صَاعِقَةٌ کہا جاتا ہے۔

جنگ بدر کی پیشگوئی:

اس سے مراد عموماً نفخہ اولیٰ یعنی قیامت کو لیا گیا ہے۔ مگر دیکھو اگلی آیت جہاں صاف فرمایا کہ یہ اس دن کا ذکر ہے جس دن ان کی تدبیر انہیں کچھ کام نہ دے گی۔ اور یہ وہی تدبیر ہے جس کا ذکر [آیت: 42] میں ہو چکا ہے ﴿اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾۔ علاوہ ازیں جیسا کہ روح المعانی میں لکھا ہے نفخہ اولیٰ پر تو وہی لوگ مریں گے جو اس وقت زندہ موجود ہوں گے۔ ان کفار پر تو وہ نفخہ اولیٰ آنے والا نہ تھا۔ اور یہاں صاف لکھا ہے کہ ان کفار کو جو آپ کو کاہن، شاعر، مفتری وغیرہ کہتے ہیں اور آپ کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں آپ چھوڑ دیں۔ یہاں تک کہ ان پر وہ دن آجائے جس میں وہ ہلاک ہو جائیں یا ان پر عذاب آجائے۔ اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہاں اس عذاب دنیا کا وعدہ ہے جو ان کفار پر آنے والا تھا۔ اور جو فی الحقیقت ان کی تدابیر کا جو وہ اسلام کے خلاف کر رہے تھے بدنتیجہ تھا اور انہی کی تدابیر کا وبال ان پر آنے والا تھا۔ جیسا کہ ﴿هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ﴾ سے ظاہر ہے۔ پس صحیح وہی قول ہے جو روح المعانی میں ہے کہ اس سے مراد یوم بدر ہے۔ اور یہی وہ دن تھا جو ﴿لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾ کا مصداق ہوا۔ اس لیے کہ وہ اسلام کے تباہ کرنے کے لیے ایک زبردست تدبیر کر کے آئے تھے اور آخر خود ہلاک ہو کر واپس ہوئے۔

3190- ﴿دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ سے مراد جنگ بدر سے پہلے ہے اور وہ جیسا کہ مجاہد نے کہا ہے قحط ہے جو سات سال کے لیے ان پر پڑا۔ (ر) یا

وَ اصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾

اور اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کر کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر جب تو اٹھے۔ (3191)

وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع 2 21 4

اور رات کے کسی حصہ میں بھی اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے ڈوبنے کے بعد بھی۔

﴿دُوْنَ﴾ یہاں صرف سوائے کے معنی میں ہے اور اشارہ عذاب قیامت کی طرف ہے۔

﴿لٰكِنَّ﴾ استدراک کے لیے آتا ہے۔ اور واؤ کے ساتھ بھی اور واؤ کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے۔

3191- ﴿بِاَعْيُنِنَا﴾ سے مراد ہے ہماری حفاظت میں۔ یعنی یہ جتنی تدبیریں چاہیں کرلیں، رسول اللہ ﷺ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اور ﴿حِيْنَ تَقُوْمُ﴾ میں مراد بعض نے نیند سے اٹھنا اور بعض نے نماز کے لیے اٹھنا لیا ہے۔ (ج) اور یا کسی مجلس سے اٹھنا۔ مگر اگلی آیت میں رات کی تسبیح کا ذکر ہے۔ اس لیے ﴿حِيْنَ تَقُوْمُ﴾ میں دن میں تسبیح کی طرف اشارہ ہے۔ اور ﴿اِدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾ یا صبح کے وقت کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ کیونکہ وہ وقت خاص طور پر قبولیت دعا کا ہے۔

اٰیَاتُهَا 62 (53) سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ (23) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ — ستارہ گواہ ہے جب وہ ڈوبتا ہے۔ (3192)

سورۃ النجم

تمہید سورت:

اس سورت کا نام اَلنَّجْمِ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 62 آیتیں ہیں اور اَلنَّجْمِ سے مراد یا ستارہ ہے اور اس لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقبال کا ستارہ غروب ہونے کو ہے اور یا اس سے مراد قرآن کریم کا ہر حصہ ہے جو نازل ہوتا ہے۔ اور اس میں آنحضرت ﷺ کے مقامات عالیہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ دونوں باتیں اس سورت کے مضمون میں داخل ہیں۔ اور پچھلی سورت میں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی طرف جو طور پر ہوئی بالخصوص توجہ دلائی تھی تو اس میں قرآن کریم اور اس وحی کے حامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے کمالات کی طرف توجہ دلائی اور وہ سورت ﴿اِدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾ پر ختم ہوتی ہے، تو اس کی ابتدا ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝﴾ سے ہوتی ہے۔ یہ سورت مکی ہے اور اس کا نزول پانچویں سال بعثت کا ہے یعنی ابتدائی مکی زمانہ کا۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حبش کی ہجرت اول ہو چکی تھی جب یہ سورت نازل ہوئی اور ابن مردویہ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو آنحضرت ﷺ نے کفار کے سامنے علی الاعلان پڑھی۔

3192- ﴿النَّجْمِ﴾ اصل میں چڑھتے ہوئے ستارے کو کہا جاتا ہے اور جمع نُجُوْمٌ ہے۔ اور نَجْمٌ کے معنی طَلَعَ یعنی چڑھا یا ظاہر ہوا۔ اور نُجُوْمٌ اس کا مصدر بھی اور نَجْمٌ سبزی کے نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور یہاں بعض کے نزدیک کوکب مراد ہے اور بعض کے نزدیک ثریا مراد ہے اور بعض کے نزدیک قرآن مراد ہے جو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا تھا۔ اور ﴿هَوٰى﴾ سے مراد اس کا نزول ہے اور ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝﴾ [الواقعة: 75:56] ''(ایسا) نہیں میں قرآن کے حصوں کے نزول کی قسم کھاتا ہوں۔'' میں دونوں معنی لیے گئے ہیں۔ اور نَجْمٌ سبزیوں میں سے وہ چیز ہے جس کی ساق نہ ہو۔ (غ) اور اہل لغت کہتے ہیں کہ نَجْمٌ بمعنی نُجُوْمٌ ہے یعنی کل ستارے۔ اور نَجْمٌ اصل میں ہر ایک ستارے پر بولا جاتا ہے اور ثریا پر بالخصوص۔ اور نُجُوْمٌ سے مراد اشیاء کے وظائف بھی لیے جاتے ہیں یعنی رزق یا ذکر وغیرہ کے وہ حصے جو روز کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں اور نَجْمٌ وقت مضروب ہے یعنی جو کسی بات کے لیے مقرر کر لیا جائے۔ (ل)

﴿النَّجْمِ﴾ کے معنی میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ① ستاروں کا بکھر جانا۔ ② ثریا۔ ③ شعری، اور کاہن اس کے طلوع

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ ② — تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ وہ بہکا ہے۔ (3193)

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۗ ③ — اور نہ خواہش نفس سے بولتا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ ④ — یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔ (3194)

کے وقت امور غیبی کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ ④ زہرہ جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ ⑤ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد وغیرھما کا قول ہے قرآن کی مقدار جو نبی ﷺ پر نازل ہوتی تھی۔ ⑥ اور جعفر صادق کا قول ہے کہ اس سے مراد نبی ﷺ ہیں اور ﴿هَوٰى﴾ سے مراد معراج کی رات آپ کا نزول ہے۔ (ر) یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں نجم کو بطور گواہ پیش کیا ہے اس بات پر کہ محمد رسول اللہ ﷺ گمراہ نہیں ہیں۔ پس اگر نجم سے مراد قرآن شریف کے نازل شدہ ٹکڑے لیے جائیں یا خود رسول اللہ ﷺ کو لیا جائے تو مطلب صاف ہے۔ یعنی قرآن کا ہر ٹکڑا جو نازل ہوتا ہے اس بات پر گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ضلالت میں نہیں۔ کیونکہ ہر ٹکڑا اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کی شہادت رکھتا ہے۔ اور اگر نجم سے مراد ایک خاص ستارہ لیا جائے یا ستارے لیے جائیں تو ان کے غروب ہونے سے صبح کا طلوع ہونا مراد ہے اور اشارہ ہے کہ جس طرح ستارے غائب ہو جاتے ہیں تو رات کی جگہ دن لے لیتا ہے اور آفتاب کی روشنی نمودار ہوتی ہے، اسی طرح دنیا پر ایک لمبی رات کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے آفتاب نے طلوع کیا ہے اور یا نجم کے غروب ہونے میں اشارہ کفار کے ستارے کے غروب ہونے کی طرف ہے۔

3193- **آنحضرت ﷺ کی عصمت عمل اور اعتقاد:** غَيٌّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو۔ [دیکھو نمبر: 330] پس ﴿مَا ضَلَّ﴾ میں نفی ضلالت کی ہے یعنی آپ طریق حق سے نہیں پھرے اور ﴿مَا غَوٰى﴾ میں نفی اعتقاد فاسد کی ہے یعنی آپ کا اعتقاد بھی صحیح ہے، یعنی عملی طور پر بھی آپ کا قدم صواب پر ہے۔ اس سے زیادہ جامع اور مانع الفاظ میں کسی کی عصمت کا ذکر نہ ہوسکتا تھا۔ عموماً صرف گناہ سے بچنے کا نام عصمت رکھا جاتا ہے یعنی کسی فعل کا خلاف حکم الٰہی صادر نہ ہونا۔ مگر قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کو نہ صرف گناہ سے محفوظ قرار دیا ہے بلکہ عقیدہ کو بھی غلطی سے پاک بتایا ہے۔ یہ آیت آپ کی عصمت پر نص صریح ہے۔ اور ﴿غَوٰى﴾ بمعنی خَابَ لے کر ﴿مَا غَوٰى﴾ میں پیشگوئی بھی ہوسکتی ہے۔ یعنی آپ کے غلطی پر نہ ہونے کو یہ بات ثابت کر دے گی کہ آپ ناکام نہیں ہوئے۔

3194- **آپ کا حرص و ہوا سے خالی ہونا:** ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ③﴾ عام ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ خواہش نفسانی سے کوئی بات نہیں کرتے اور ﴿اِنْ هُوَ﴾ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف ہے۔ جس کا ذکر اوپر ﴿وَالنَّجْمِ﴾ میں موجود ہے۔ اور اگر نجم سے مراد ستارہ لیا جائے تو پھر بھی ﴿اِنْ هُوَ﴾ میں ضمیر قرآن کی طرف ہی ہوگی۔ کیونکہ قرآن شریف کا ذکر اس طرح پر بارہا آیا ہے۔ اور بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ یہ سوال مقدر کا جواب ہے۔ یعنی جب یہ کہا گیا کہ آپ حرص و ہوا سے کوئی بات بھی نہیں

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ اسے مضبوط قوتوں والے نے سکھایا ہے۔ (3195)

ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ﴿۶﴾ حکمت والے نے۔ سو وہ اعتدال پر قائم ہوا۔ (3196)

کرتے، تو اس پر سوال ہوتا تھا کہ پھر یہ قرآن کیا ہے؟ تو اس کا جواب دیا ہے کہ یہ وحی ہے۔ بہر حال ضمیر قرآن شریف کی طرف ہے، خواہ اس کا ذکر پہلے مانا جائے یا نہ۔ اور ضمیر کو نطق کی طرف لینا اس لیے درست نہیں کہ یہ کسی کے نزدیک بھی مسلم نہیں کہ آپ کا سارا کلام یا کم از کم نبوت کے بعد کا ہی سارا کلام وحی سے تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ کا اجتہاد بھی وحی خفی کی روشنی سے تھا۔ مگر پھر بھی اس نطق کو مسائل دینی پر محدود کرنا پڑے گا۔ حالانکہ **يَنْطِقُ** عام ہے اور حرص و ہوا سے آپ کا کوئی کلام قبل از نبوت بھی نہ تھا چہ جائیکہ بعد از نبوت کسی کلام کو ایسا مانا جائے۔ اور یہ الفاظ بھی آپ کی عصمت پر صریح دلیل ہیں، کیونکہ گناہ بغیر ہوائے نفس کے پیدا نہیں ہوتا۔

3195- ﴿**الْقُوٰى**﴾ ﴿**قُوَّةٌ**﴾ کا استعمال کبھی قدرت کے معنی میں ہوتا ہے جیسے ﴿**خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ**﴾[البقرة: 63:2] ''جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے زور سے پکڑ رکھو'' اور کبھی اس استعداد کے لیے جو کسی شے میں موجود ہو جیسے گٹھلی کو کہا جائے یہ کہ بالقوہ درخت ہے اور کبھی اس کا استعمال بدن میں ہوتا ہے اور کبھی قلب میں اور کبھی کسی خارجی معاون کے متعلق اور کبھی قدرت الٰہیہ کے متعلق۔ قوت بدن میں جیسے ﴿**مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً**﴾[حٰمٓ السجدة: 15:41] ''کون طاقت میں ہم سے زیادہ مضبوط ہے۔'' ﴿**فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ**﴾[الكهف: 95:18] ''سو تم مجھے (اپنی) قوت سے مدد دو'' اور قلب میں قوت کی مثال ﴿**يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ**﴾[مريم: 12:19] ''اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ'' اور خارجی معاون کی مثال جیسے ﴿**لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً**﴾[هود: 80:11] ''کاش! مجھ میں تمہارے (مقابلہ) کے لیے طاقت ہوتی'' یعنی کوئی لشکر ہوتا یا مال۔ ایسا ہی ﴿**نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ**﴾ [النمل: 33:27] ''ہم قوت والے ہیں'' اور قدرت الٰہیہ کی مثال ﴿**اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ**﴾[الحديد: 25:57] ''اللہ قوت والا غالب ہے۔'' ﴿**اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ**﴾[الذاريات: 58:51] ''اللہ ہی رزق دینے والا قوت والا زبردست ہے۔'' جس میں وہ قوت بھی شامل ہے جو مخلوق کے لیے ہے۔ اور ﴿**ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ**﴾[التكوير: 20:81] ''طاقت والے صاحب عرش کے نزدیک مرتبے والے پر'' سے مراد جبریل ہے اور ﴿**عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى**﴾[النجم: 5:53] ''اسے مضبوط قوتوں والے نے سکھایا ہے۔'' میں لفظ جمع استعمال کیا گیا ہے (یعنی **قُوٰى** **قُوَّةٌ** کی جمع ہے) تو مطلب یہ ہے کہ اس عالم کے لحاظ سے اور ان لوگوں کے لحاظ سے جنہیں سکھاتا اور فائدہ پہنچاتا ہے وہ بہت قوتوں والا ہے اور عظیم قدرت والا ہے اور بیابان کو **قِوَاء** کہا جاتا ہے اور [**اَقْوَى الرَّجُلُ**] کے معنی ہیں وہ بیابان میں گیا۔ ﴿**وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ**﴾[الواقعة: 73:56] ''اور مسافروں کے لیے سامان بنایا۔'' (غ)

3196- ﴿**ذُوْ مِرَّةٍ**﴾ ﴿**مُرُوْرٌ**﴾ کے معنی ایک چیز سے گزر جانا اور آگے نکل جانا ہیں۔ ﴿**وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ**﴾[المطففين: 30:83] ''اور جب ان پر گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔'' ﴿**وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا**﴾[الفرقان: 72:25] ''اور

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ اور وہ بلند انتہائی مقامات پر ہے۔ (3197)

جب لغو پر گزرتے ہیں بزرگانہ طور پر گزرتے ہیں۔'' میں یہ تنبیہ ہے کہ جب انہیں لغویات کی طرف دھکیلا جاتا ہے تو اس سے الگ ہو جاتے ہیں اور جب اسے سنتے ہیں تو کان بند کر لیتے ہیں اور جب اسے دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ﴾ [یونس: 12:10] ''پھر جب ہم اس کا دکھ دور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے۔'' میں مراد ہے اعراض کرتا ہے اور [اَمْرَرْتَ الْحَبْلَ] کے معنی ہیں میں نے رسہ کو بٹا اور اسی سے ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ ہے۔ گویا کہ وہ مضبوط بٹا ہوا ہے۔ (غ) اور ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ کے معنی ہیں صاحب عقل اور اصالت اور احکام اور مِرَّة قوت ہے۔ (ل) گویا شَدِيْدُ الْقُوٰى میں قوت فعل کا ذکر ہے اور ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ میں قوت نظری اور عقلی کا۔ (ر) اور مِرَّةٌ جز و زمان ہے یعنی ایک بار اور مَرَّتَيْنِ دو بار، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تین بار۔ (غ)

آنحضرت ﷺ کے جملہ قویٰ کا حالت اعتدال پر ہونا:

﴿شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ اور ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ سے مراد جبریل لیے گئے ہیں اور جبریل کا آنحضرت ﷺ کو تعلیم دینا اس لحاظ سے ہے کہ وہی حامل وحی ہیں جو آنحضرت ﷺ تک وحی الٰہی کو پہنچاتے ہیں اور حسن سے منقول ہے کہ ﴿شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ اور ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ اللہ تعالیٰ ہے اور جمع (یعنی قوی) تعظیم کے لیے ہے۔ (ر) تو اس صورت میں مراد صرف اس قدر ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو سکھایا۔ اور ﴿فَاسْتَوٰى﴾ کے معنی ہیں اپنی ذات میں حالت اعتدال پر ہوا۔ دیکھو [نمبر: 1095] اور اس کو عموماً جبریل کے متعلق ہی سمجھا گیا ہے اور استویٰ سے مراد یہ لی گئی ہے کہ جبریل اپنی صورت حقیقی پر ظاہر ہوئے اور حسن نے ﴿فَاسْتَوٰى﴾ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لی ہے اور اِسْتَوَاءٌ اور افق اعلیٰ پر ہونے سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت اور سلطان کا اظہار لیا ہے۔ (ر) لیکن ﴿فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝﴾ میں تمام ضمیریں ایک ہی طرف جاتی ہیں اور ﴿ثُمَّ دَنَا﴾ میں حسن نے ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف مانی ہے اور جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا ان الفاظ میں ذکر نبی کریم ﷺ کا ہی ہے اور آپ کا ذکر ﴿فَاسْتَوٰى﴾ میں ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ آپ اپنی تمام قوتوں کے لحاظ سے حالت اعتدال پر ہیں۔ گویا کوئی قوت ایسی نہیں کہ حد سے تجاوز کر گئی ہو۔ نہ کوئی قوت ایسی ہے کہ دوسری قوتوں سے دب کر ناقص رہ گئی ہو۔ اور قوتوں کا حالت اعتدال پر ہونا آپ کے عملی کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ گویا ﴿مَا ضَلَّ﴾ کے مقابلہ پر ہے یعنی آپ کی عصمت عملی پہلو میں ﴿مَا ضَلَّ﴾ سے ثابت ہے۔ لیکن چونکہ نفی ضلالت سے کوئی کمال ثابت نہیں ہوتا اس لیے یہاں فرمایا کہ آپ کی عملی قوتیں تمام حالت اعتدال پر قائم ہونے کی وجہ سے کمال کو پہنچ گئیں ہیں۔

3197- ﴿بِالْاُفُقِ﴾ اُفُقٌ وہ ہے جو انتہائے فلک اور اطراف زمین سے ظاہر ہے اور آنحضرت ﷺ کی مدح میں ہے [وَأَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَّ أَشْرَقَتِ الأَرْضُ ... وَضَاءَتْ بِنُورِكَ الْأُفُقُ] (لسان العرب، باب: حرف الهمزة) یعنی جب آپ پیدا ہوئے تو زمین چمک اٹھی اور افق آپ کے نور سے روشن ہو گیا (یعنی زمین کے انتہائی مقامات) اور آفِقٌ (یعنی افق میں جانے والا) وہ ہے جو علم اور کرم میں غایت کو پہنچ جائے اور جائز ہے کہ اُفُقٌ فُلْكٌ کی طرح واحد اور جمع دونوں پر استعمال ہو۔ (ل)

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ﴿۸﴾ پھر قریب ہوا اور بہت قریب ہوا۔ (3198)

آنحضرت ﷺ کے جملہ قویٰ کا کمال کو پہنچنا:

﴿وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۭ﴾ میں بھی رسول کریم ﷺ کا ہی ذکر ہے جیسا کہ اوپر دکھایا گیا اور آپ کے افق اعلیٰ میں ہونے سے یہ مراد ہے کہ آپ علو اور بلند مرتبگی کے انتہائی مقامات کو پہنچ گئے اور یہ ﴿فَاسْتَوٰى﴾ کے لیے بطور ایک تتمہ کے ہے۔ یعنی وہ قویٰ ایسی حالت میں اعتدال پر قائم ہیں کہ کمال کو بھی پہنچ چکی ہیں۔ بالفاظ دیگر باوجود اس کے کہ آپ کی ہر ایک قوت کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اعتدال پر بھی قائم ہے۔ اور یہ آپ کے اخلاق کا پہلو ایسا ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آپ کی ہر ایک نیکی کا اظہار اس وقت ہوا ہے کہ جب حالات کلیۃً اس کے مخالف تھے۔ مثلاً بادشاہ رہ کر آپ نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔ اگر بادشاہت کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی اختیار کرتے تو یہ کمال قوت پر دال نہ تھا۔ اسی طرح آپ کی قوت عفو اپنے کمال میں دشمنوں کے ساتھ جنگ میں فتح کے وقت ظاہر ہوئی اور دوستوں کے ساتھ جنگ میں نافرمانی کے وقت۔ جب نافرمانی سے قومی نقصان ہوا جیسے احد کی جنگ میں۔ اسی طرح آپ کے تمام اخلاق کی حالت ہے، مگر ان کی تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں۔ اور یہاں یہ بتایا ہے کہ نہ صرف آپ کے تمام اخلاق کمال کو پہنچے بلکہ کمال کے ساتھ انتہائی مقامات تک پہنچ گئے جہاں تک انسان کے لیے پہنچنا ممکن تھا۔ اور آپ کے کمالات تمام پر فوقیت لے گئے۔

3198- ﴿فَتَدَلّٰى﴾ دیکھو [نمبر: 1064] اور مفردات میں ہے [اَلتَّدَلِّی الدُّنُوُّ وَالْاِسْتِرْسَالُ] یعنی ﴿فَتَدَلّٰى﴾ کے معنی قریب ہونا اور موانست چاہنا ہے اور لسان العرب میں [تَدَلّٰی عَلَیْنَا] کے معنی دیئے ہیں وہ ہمارے پاس آیا اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ دَنٰی اور تَدَلّٰی کے ایک ہی معنی ہیں یعنی [قُرْبَ فَتَدَلّٰی اَیْ زَادَ فِی الْقُرْبِ] یعنی تَدَلّٰی کے معنی ہیں قرب میں بڑھا۔

آنحضرت ﷺ کا قرب اللہ تعالیٰ سے:

اکثر مفسرین نے تو یہاں ضمیر جبریل کی طرف ہی لی ہے اور مراد یہ لیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت علیہ السلام سے قریب ہوئے اور پھر اور زیادہ قریب ہوئے اور یہی لفظ حدیث اسراء میں بھی آتے ہیں۔ [فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ] اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ وہاں بھی جبریل علیہ السلام کا قرب آنحضرت ﷺ سے ہی مراد ہے۔ مگر جبریل علیہ السلام کے آنحضرت ﷺ سے قرب کو خاص طور پر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، بلکہ یہ ذکر بھی آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ہے۔ اور ابن جریر کی روایت جو انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے صاف بتاتی ہے کہ وہاں ذکر آنحضرت ﷺ کا ہی ہے۔ [ثُمَّ عَلاَ بِهِ فَوْقَ ذَلِكَ بِمَا لاَ يَعْلَمُهُ إِلَّا اللهُ، حَتَّى جَاءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهَى وَدَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلَّى حَتَّى كَانَ مِنْهُ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنَى] (صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب: قَوْلِهٖ: وَكَلَّمَ اللهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، حدیث: 7517) یہ ذکر جبریل علیہ السلام کے آنحضرت ﷺ سے قرب کا نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ہے اور اسی کے مطابق بخاری میں شریک کی روایت ہے جو انس رضی اللہ عنہ سے ہے، معراج کا ذکر ہے۔ جس میں بعینہٖ یہی لفظ آتے ہیں۔ یہ دونوں روایتیں اس بات کو واضح کرتی

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝٩ سو وہ دو کمانوں کا وتر ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب۔ (3199)

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝١٠ سواس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، جو وحی کی۔ (3200)

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝١١ جواس نے دیکھا وہ دل نے جھوٹ نہیں کہا۔

ہیں کہ یہاں ذکر آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ہے نہ جبریل علیہ السلام کے آنحضرت ﷺ سے قرب کا۔ جو فی الحقیقت اس قدر اہمیت سے بیان کرنے کی بات بھی نہ تھی۔

3199- ﴿قَابَ﴾ قاب وہ ہے جو قبضہ اور گوشۂ کمان کے درمیان ہے۔

﴿قَوْسَيْنِ﴾ قَوْسٌ کمان ہے جس سے تیر چلایا جاتا ہے۔

﴿قَابَ قَوْسَيْنِ﴾ کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں یعنی [قَدْرَ قَوْسَيْنِ] یا دونوں کمانوں کا اندازہ۔ اور دوسرے معنی یہ کیے گئے ہیں [كَانَ مِنْهُ حَيْثَ الْوَتْرُ مِنَ الْقَوْسِ] یعنی اس مرتبہ پر جیسے وتر قوس سے ہوتا ہے۔ پہلے معنی لے کر بھی یہ مطلب نہیں کہ جبریل علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ میں یا آنحضرت ﷺ اور اللہ تعالیٰ میں دو کمانوں کا فاصلہ رہا، یہ بے معنی بات ہے۔ کیونکہ ایسا فاصلہ اجسام میں ہوسکتا ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ ہے جیسا کہ خفاجی نے کہا ہے کہ ایام جاہلیت میں عرب جب ایک دوسرے سے مضبوط عہد کرتے تھے تو وہ دو کمانیں نکالتے تھے اور ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے تھے اور دونوں کے قاب مل جاتے تھے، یہاں تک کہ وہ گویا ایک ہی قاب والی ہوجاتی تھیں۔ پھر ان دونوں کو اکٹھا کھینچتے اور ان سے ایک تیر چلاتے۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ان میں سے ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے اور ایک کی ناراضگی دوسرے کی ناراضگی ہے اور اس کے خلاف ممکن نہیں۔ (ر) پس مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے ایسا قرب شدید کا تعلق ہوا جس سے بڑھ کر قرب ممکن نہیں۔ اسی لیے ﴿قَابَ قَوْسَيْنِ﴾ کے بعد ﴿اَوْ اَدْنٰى﴾ کے لفظ بڑھائے ہیں۔ یعنی گو دو کمانوں کے ملانے والے کا تعلق بھی بہت شدید ہوتا ہے مگر آنحضرت ﷺ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس سے بھی قریب تر تھا۔ یعنی انسانی تعلقات جس قدر قرب کو ظاہر کرسکتے ہیں اس سے بڑھ کر آپ کا تعلق ہے۔ پس ﴿فَاسْتَوٰى﴾ میں اخلاق کے کمال کا ذکر کیا ہے اور ﴿دَنَا فَتَدَلّٰى﴾ میں قرب الٰہی کے کمال کا ذکر کیا ہے۔

3200- یہاں بھی مفسرین نے ضمیر جبریل کی طرف مانی ہے مگر ﴿عَبْدِهٖ﴾ میں اللہ کی طرف ضمیر لی ہے۔ حالانکہ اگر ان سب ضمیروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف لیا جائے تو سیاق اور معنی دونوں کے لحاظ سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اور ﴿مَآ اَوْحٰى﴾ کا ابہام اس کی تفہیم کے لیے ہے یعنی بڑی عظیم الشان وحی۔ اور وہ وحی قرآنی جس سے بڑھ کر طاقتور وحی کوئی نہیں ہوئی۔ اور اگلی آیت میں ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ﴾ کہہ کر بتا دیا کہ اس وحی کا تعلق قلب رسول سے ہے جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا: ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [البقرة:

أَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے؟

وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ اور اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا۔ (3201)

97:2] ''تو اس نے اسے تیرے دل پر اتارا'' اور اگر اسے معراج کے متعلق مانا جائے جیسا اکثر مفسرین کا خیال ہے تو اس سے ثابت ہے کہ معراج بھی اس جسد عنصری کے ساتھ نہ تھا۔ کیونکہ جو کچھ دیکھا وہ دل نے دیکھا اور دل کا دیکھنا ان آنکھوں سے نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر یہ جسد جاتا تو چاہئے تھا کہ ان آنکھوں سے دیکھنے کا ذکر ہوتا۔ پہلی آیات میں یہ بتا کر کہ آنحضرت ﷺ نے کمالات انسانی کے انتہائی مراتب کو طے کیا اور پھر قرب الٰہی کے غایت مدارج پر پہنچے۔ آخر پر فرمایا کہ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اس قرآن کو وحی کیا اور یوں بتا دیا کہ اب اگر کوئی شخص کمالات انسانی اور قرب الٰہی پر پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہی راستہ ہے۔ اور آیت ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾﴾[12] میں اسی وحی کی طرف ہی اشارہ ہے۔ اسی لیے مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے اور کفار کا جھگڑا ابھی قرآن کریم پر ہی تھا اور یہ جو بعض روایات میں ہے کہ ﴿مَآ اَوْحٰى﴾ سے مراد وہ ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے ظاہر نہیں فرمایا تو یہ بالبداہت غلط ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کل وحی کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہی مبعوث ہوئے تھے۔

3201- ﴿نَزْلَةً﴾[اَلْمَرَّةُ الْوَاحِدَةُ مِنَ النُّزُوْلِ] (ل) یعنی ایک مرتبہ کا نزول۔

آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا کس طرح تھا:

﴿رَاٰهُ﴾ کسے دیکھا؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ یہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے اور کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں دو مرتبہ اپنی اصلی صورت پر دیکھا اور ان کے چھ سو پر تھے۔ اور بہت سے مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول میں اس کی تفسیر منقول ہے[رَاٰى رَبَّهٗ بِقَلْبِهٖ] اپنے رب کو اپنے قلب سے دیکھا۔ (ج) اور حسن سے بھی روایت ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ اور چونکہ میں دکھا چکا ہوں کہ اوپر کی آیات میں جبریل علیہ السلام کا نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کا ذکر ہے اس لیے اسی ذکر کو جاری رکھا ہے۔ اور یا تو یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور یا مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا۔ اور گو اس دوسرے معنی کے متعلق کوئی قول مروی نہیں۔ مگر میرے نزدیک اسے ترجیح ہے اور یہ معراج نبوی کی طرف اشارہ ہے۔ گو اصل مقصود اس میں یہی ہے کہ آپ کے مقامات عالیہ بتائے جائیں۔ اور جیسا کہ اگلے نوٹ سے ظاہر ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ سدرۃ المنتہیٰ آسمان پر ایک درخت ہے، جیسے یہاں ہوتے ہیں اور نبی کریم ﷺ وہاں گئے۔ بلکہ اس مقام علو تک پہنچنا مراد ہے۔ جس طرح ﴿وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ﴿۷﴾﴾ سے یہ مراد نہیں کہ آپ افق میں کہیں چلے گئے تھے اور خواہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا اپنے آپ کو دیکھا، دونوں صورتوں میں سدرۃ المنتہیٰ میں کوئی جسمانی بلندی مراد نہیں

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ (3202)

جہاں اللہ تعالیٰ بیٹھا ہوا ہو۔ اور ان الفاظ سے معراج کے جسد عنصری کے ساتھ ہونے پر دلیل پکڑنا غلط ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا؟ سو اس پر دونوں قسم کی روایات ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لفظ تو صحیح بخاری میں یہ ہیں کہ جو شخص یہ تین باتیں کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اول یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور آپ نے آیت ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾[الأنعام: 103:6] ''نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔'' پڑھی۔ اور دوم یہ کہ آپ کل کی باتوں کو جانتے تھے اور آپ نے آیت ﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾[لقمان: 34:31] ''اور کوئی شخص نہیں جانتا کل کیا کرے گا۔'' پڑھی۔ اور سوم یہ کہ آپ نے وحی سے کچھ مخفی رکھا تھا۔ اور آپ نے آیت ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾[المآئدة: 67:5] ''پہنچا دے جو کچھ تیری طرف اتارا گیا۔'' پڑھی۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ آپ نے دو دفعہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب سے دیکھا۔ اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھا، تو ابن کثیر کہتے ہیں اس بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بہر حال ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ صاف اس کے خلاف ہے۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے معنی بھی اسی قدر ہو سکتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ قلب سے دیکھنا یا کشف یا رؤیا میں دیکھنا اس کے خلاف نہیں۔ پس حق یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب سے دیکھا۔ اور بعض حدیثوں میں رؤیا میں دیکھنے کا بھی ذکر ہے اور یہ آیت ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ کے خلاف نہیں۔

3202- ﴿سِدْرَةٍ﴾ سِدْرٌ ایک درخت ہے جو کھانے میں تھوڑا کام دیتا ہے ﴿وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ﴾[السبأ: 16:34] ''اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔'' اور بعض وقت اسے بے کانٹا کیا جاتا ہے اور اس کے سایہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے ظل جنت اور اس کی نعمتوں کے لیے یہ مثال کے طور پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ ﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾﴾[الواقعة: 28:56] ''بیریوں میں (ہیں) جن کے کانٹے نہیں۔'' کیونکہ سایہ دینے میں وہ بہت کام آتا ہے۔ اور ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾﴾[16] میں اشارہ اس مرتبہ کی طرف ہے جس کے لیے نبی ﷺ کو خاص کیا گیا۔ افاضۂ الٰہیہ اور نعمائے جسمانیہ میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے نبی ﷺ سے بیعت کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں مسلمانوں پر سکینت نازل کی۔ (غ) اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ ﴿سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾﴾ جنت کی انتہائی حد پر ہے، جس پر اولین اور آخرین کا علم منتہی ہو جاتا ہے۔ (ن) اور مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ اسے سدرۃ المنتہیٰ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر تمام عالموں کا علم ختم ہو جاتا ہے اور کعب کا قول ہے کہ ملک مقرب ہو یا نبی مرسل ہو سب کا علم اس پر ختم ہو جاتا ہے اور جو اس کے آگے ہے وہ غیب ہے، جسے اللہ کے سوائے کوئی نہیں جانتا۔ اور ایک قول ہے کہ جو کچھ زمین کے اوپر چڑھتا ہے وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے، اس سے آگے نہیں۔ اور ایک قول ہے کہ وہ ہر شخص کی انتہا ہے جو سنت رسول اللہ ﷺ پر چلتا ہے۔ (ج) اور بعض حدیثوں میں اس کے پتوں کا ذکر ہے کہ وہ ہاتھی کے کانوں کی طرح ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس کا ایک ایک پتہ کل امت کو ڈھانک سکتا ہے۔ (ج) اور

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ اسی کے پاس جنت ہے جو اصل ٹھکانا ہے۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ جب سدرہ پر چھا رہا تھا، جو چھا رہا تھا۔ (3203)

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ آنکھ پھری نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔ (3204)

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ اس نے اپنے رب کے بڑے بڑے نشانات دیکھے۔ (3205)

بعض روایات میں ہے کہ یہ وسط جنت میں ایک درخت ہے اور بعض میں ہے کہ اس سے چار نہریں نکلتی ہیں۔ دو باطنی اور دو ظاہری۔ اور ظاہری نہریں دجلہ اور فرات کو کہا گیا ہے۔ اور بعض میں ہے کہ اس میں پانی اور دودھ اور خمر اور شہد کی نہریں نکلتی ہیں، جن کا ذکر نعمائے جنت میں ہے۔ ان تمام روایات سے ظاہر ہے کہ محض لفظ **سِدْرَةٌ** کی وجہ سے اسے ایک ایسا درخت سمجھنا جیسے ہم یہاں بیری کے درخت دیکھتے ہیں۔ گو وسیع پیمانہ پر ہی ہو، صحیح نہیں۔ بلکہ اس سے مراد ایک خاص مقام ہے جس سے آگے کسی انسان کا علم ترقی نہیں کر سکتا۔ تو بتانا یہ مقصود ہے کہ آپ ﷺ کا علم بھی اس کمال کو پہنچا، جس سے آگے ترقی ممکن نہیں۔ جیسا کہ **فَاسْتَوٰى** میں بتایا تھا کہ آپ کے کمالات عملی انتہائے علو کو پہنچے اور آپ کا علم ایسا کامل ہوا کہ تا قیامت اب کوئی ترقی علمی اس کو باطل نہیں کر سکتی۔ بلکہ جس قدر علم دنیا میں ترقی کرے گا اسی قدر علوم قرآنی کی صداقت ظاہر ہوگی۔ بالفاظ دیگر تمام انسانوں سے بڑھ کر آپ کو علم دیا گیا اور یوں علم و عمل دونوں لحاظ سے آپ کی وہ تکمیل کی گئی جس سے آگے انسان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے آپ خاتم النبیین بھی ہوئے۔ کیونکہ جب آپ کا نور نبوت علم اور عمل دونوں پہلوؤں سے کمال کو پہنچ گیا۔ تو اب دنیا کو اور کسی نور کی حاجت نہ رہی۔ اور اگر راہ میں ضمیر مفعول اللہ تعالیٰ کے لیے مانی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ معرفت الٰہی میں آپ کو وہ کمال حاصل ہوا جو دوسرے کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا۔ اور اگلی آیت ﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾﴾ میں بتایا کہ ایسے علم یا ایسی معرفت کے حصول سے انسان جنت کو بھی پورے طور پر پا لیتا ہے۔

3203- حسن سے مروی ہے کہ وہ ڈھانکنے والی چیز نور رب العزت ہے۔ اسی کے مطابق سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ (ر)

3204- **بَصَرَ** نظر کو کہتے ہیں اور بصیرت کو بھی [دیکھو نمبر: 121] اور چونکہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے کہ جن باتوں کا یہاں ذکر ہے وہ بصیرت سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے یہاں مراد بصیرت ہی ہے۔ اور ﴿مَا زَاغَ﴾ میں بتایا کہ آپ اصل مقصد سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئے اور ﴿مَا طَغٰى﴾ میں یہ کہ حد سے متجاوز نہیں ہوئے۔

3205- ان آیات سے مراد وہ عجائبات ہیں جو معراج میں آپ کو دکھائے گئے جن میں نہ صرف آپ کے کمالات ہی ظاہر کیے گئے بلکہ آپ کی اور آپ کے دین کی کامیابیوں کی بھی بشارت دی گئی۔ اور یہاں ﴿رَبِّهٖ﴾ کا لفظ لا کر خود بتا دیا کہ مراد وہ آیات ہیں جن

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾	تو کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟
وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾	اور منات تیسرے اور کو؟ (3206)
اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾	کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں؟
تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾	یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔ (3207)

میں آپ کی ربوبیت روحانی یا آپ کے ذریعہ سے جو ربوبیت روحانی ہونے والی تھی اس کی طرف اشارہ تھا۔ اور ان آیات کبریٰ کے دیکھنے کے لیے مع جسم آسمان پر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عجائبات آپ کو اسی آنکھ سے دکھائے جو انبیاء کو دی جاتی ہے۔ رہا معراج کا جسد عنصری کے ساتھ ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے [دیکھو نمبر: 1801] جہاں مفصل بحث گزر چکی ہے۔

3206- لات ثقیف کا بت طائف میں تھا اور عزیٰ غطفان کا بت نخلہ میں تھا۔ (ج) اور منات غزاع کا بت تھا اور لات کو اللہ کی، عزیٰ کو العزیز کی تانیث سمجھتے تھے (ج) اور لات انسان کی شکل پر تھا اور عزیٰ درخت کی صورت پر اور منات پتھر تھا۔ اسی لیے اسے الگ بیان کیا ہے اور ﴿الْاُخْرٰى﴾ یہاں ذم کے لیے ہے۔ (ر) یہ سب نام مؤنث پر ہیں۔ گویا یہ ان کی دیویاں تھیں جنہیں وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ اپنے لیے بیٹے تجویز کرتے ہو اور خدا کے لیے بیٹیاں۔

3207- ﴿ضِيْزٰى﴾ ضَازَ کے معنی ہیں جَارَ ظلم کیا اور ﴿ضِيْزٰى﴾ ناانصافی یا ظلم ہے۔

غرانیق کا جھوٹا قصہ:

اس موقع پر واقدی کی ایک روایت پر جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ ایسی لچر ہے کہ قرآن کریم کے کھلے الفاظ کے سامنے وہ قابل غور بھی نہیں۔ مگر چونکہ عیسائیوں نے اس پر بہت زور دیا ہے اور اسے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے اس لیے مختصراً اس کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب نبی ﷺ اس سورت کو پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے تو آپ نے بجائے ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾﴾ کے یہ الفاظ پڑھ دیئے۔ [تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَجٰى] (المعجم الكبير، باب العين، عثمان بن حنيف الأنصاري من أخباره، حديث: 8316) یعنی یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے۔ ایسی خرافات اور قرآن جیسا پُر حکمت کلام! اس سورت کے متعلق یہ مسلم امر ہے کہ علی الاعلان کفار میں پڑھی گئی اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو نبی کریم ﷺ نے علی الاعلان کفار کو سنائی اور یہ پہلی سورت تھی جس میں سجدہ نازل ہوا اور سجدہ کے موقعہ پر نبی ﷺ نے سجدہ کیا۔ اور آپ کے ساتھ ہی سب سامعین نے بھی جن میں مشرک بھی تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس خیال کو تو سورت کا لفظ لفظ دھکے دے رہا ہے۔ اگر بالفرض دو آیتیں چھوڑ کر ان کی بجائے یہ لفظ رکھے بھی جائیں تو اگلی تمام آیات پھر اس خیال کی کھلی کھلی تردید کر رہی ہیں۔ کیونکہ [آیت: 23] میں صاف طور پر ان

اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾

یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری۔ یہ لوگ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی جو (ان کے) نفس چاہتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾

کیا انسان کو وہ مل جاتا ہے جس کی وہ آرزو کرتا ہے۔

فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ ع 1 25 5

تو آخرت اور پہلی زندگی اللہ کے اختیار میں ہے۔

وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ

اور کتنے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ کام

بتوں کو ناکام قرار دیا ہے جن کے نیچے کچھ حقیقت نہیں۔ اور اس سے بھی آگے چل کر [آیت:36] میں فرشتوں کی شفاعت کو بھی اذن الٰہی سے مشروط کیا ہے۔ بتوں کی شفاعت کا اقرار یہاں کس طرح موزوں ہوسکتا ہے۔ اور [آیت:28-27] میں پھر وہی مضمون ہے جس کی طرف اشارہ ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾﴾ میں ہے۔ پھر اس سے آگے ساری سورت کو پڑھ جاؤ جن کفار کو یہ کہہ دیا کہ تمہارے بت بھی واقعی خدا کے ہاں سفارشی ہیں، کیا انہیں ایسے الفاظ میں مخاطب کیا جاسکتا تھا؟ ﴿ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾[30] ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾﴾[31] ﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾﴾[33] ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾﴾[38] ﴿وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾﴾[39] پھر اس سے آگے مختلف قوموں کی ہلاکت کا ذکر ہے۔ اگر بتوں کی شفاعت تسلیم کرلی تھی تو پھر باقی اختلاف کس بات پر تھا جس پر اس قدر تہدید کفار سے کی جاتی جو اس سورت میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں ان کو سنا دیا کہ ان کی ہلاکت کی گھڑی سر پر آپہنچی۔ واقدی نے بہتیری موضوع حدیثوں کو لکھ مارا ہے اور محدثین اس کی سند کو کچھ بھی وقعت نہیں دیتے۔ کسی زندیق نے ایک روایت بنا کر مشہور کردی اور واقدی یا زہری نے اسے قبول کرلیا۔ تو یہ اتنے اہم معاملہ پر کوئی دلیل نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی نبوت سے پہلے بھی تاریخی طور پر شرک اور بت پرستی کی آمیزش سے پاک ثابت ہے، چہ جائیکہ نبوت کے اندر ایسے واقعات کا وہم دل میں لایا جائے۔ پھر ایسے وقت میں جب کفار کی طرف سے سخت ترین تکلیفیں پہنچ کر مسلمان ہجرت کر کے حبش جا چکے تھے۔ کسی محقق نے اس روایت کو قبول نہیں کیا اور حدیث کی کسی کتاب میں اس کو جگہ نہیں ملی۔ پھر یہ مسلمہ تاریخ کے خلاف ہے، اس لیے سوائے سخت تعصب یا حد درجہ کی سادگی کے کوئی شخص ایسی روایات کا نام تک بھی نہ لے گا۔ نیز [دیکھو نمبر: 2237] و[نمبر: 3220]

شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى ﴿۲۶﴾

نہیں دیتی۔ مگر اس کے بعد کہ اللہ جسے چاہے اور پسند کرے، اجازت دے۔ (3208)

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾

وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے رکھتے ہیں۔ (3209)

وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾ۚ

اور انہیں اس کا کچھ علم نہیں، وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ظن حق کے مقابل پر کچھ کام نہیں دیتا۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَ لَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾

سو اس سے منہ پھیر لے جو ہمارے ذکر سے پھر جاتا ہے اور سوائے دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں چاہتا۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾

ان کے علم کا منتہا یہی ہے، تیرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہے اور وہ اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت پر ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾ۚ

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو جو برا کرتے ہیں ان کے عمل کا بدلہ دے اور انہیں جو نیکی کرتے ہیں اچھا بدلہ دے۔

3208- **شفاعت کس کے لیے ہے:** ﴿يَرْضٰى﴾ کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جب تک ایک شخص نے حصول رضائے الٰہی کی راہوں پر چلنے کی کوشش نہیں کی تو اسے شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتا اللہ تعالیٰ کی رضا بھی اس کے لیے نہیں ہو سکتی۔

3209- یہ لوگ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، یہ سب بت پرستی کی تردید چلتی ہے۔ کہاں یہ تعلیم اور کہاں بتوں کی شفاعت!

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ ع 2 7 6

وہ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں سوائے اس کے کہ خیال دل میں گزرے۔ تیرا رب وسیع مغفرت والا ہے۔ وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب تمہیں زمین سے پیدا کرتا ہے اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے ہوتے ہو، سو اپنے نفسوں کو پاک نہ ٹھہراؤ۔ وہ اسے خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ (3210)

3210- ﴿اللَّمَمَ﴾ لَمَمٌ۔ لَمَمْتُ کے معنی ہیں جمع کیا۔ ﴿وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾﴾[الفجر: 19:89] ''اور میراث سب کچھ سمیٹ کر کھا جاتے ہو'' معصیت کے قریب ہونا ہے۔ [اَلْمَمْتُ بِكَذَا] کے معنی ہیں میں اس پر آیا اور اس کے قریب ہوا بغیر اس کے کہ اس میں داخل ہوا۔ اور لَمْ نفی ہے جو ماضی کے لیے آتی ہے گو فعل مستقبل پر داخل ہوتی ہے۔ (غ) اور اِلْمَامٌ لغت میں یہ ہے کہ ایک چیز کے وقت پر تو آئے مگر اس کو کرے نہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی مغائر لیے ہیں۔ اور کلبی نے کہا کہ وہ نظر ہے جو بغیر ارادہ کے پڑ جائے تو یہ لَمَمٌ ہے لیکن اس کا دہرانا لَمَمٌ نہیں بلکہ ذنب ہے۔ (ل)

﴿تُزَكُّوْٓا﴾ تَزْكِيَةٌ دو طرح پر ہے۔ ایک فعل کے ساتھ اور وہ اچھا ہے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾﴾[الشمس: 9:91] ''وہ کامیاب ہوا جس نے اسے پاک کیا'' اور دوسرا قول کے ساتھ اور یہ مذموم ہے کہ انسان آپ اپنا تزکیہ قول سے کرے۔ یعنی اپنے آپ کو مزکی قرار دے، اسی سے یہاں منع کیا ہے۔ کیونکہ عقلاً اور شرعاً انسان کا اپنی مدح آپ کرنا ایک فعل قبیح ہے۔ (غ)

﴿اَجِنَّةٌ﴾ جَنِيْنٌ کی جمع ہے اور یہ بچے کا نام ہے جب تک کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہے۔ اور یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ (غ) یعنی نظر سے مخفی جَنّ سے جس کے معنی چھپانا ہیں اور جُنَّةٌ ڈھال کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے صاحب کو بچا لیتی ہے۔ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾[المجادلة: 16:58] ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ انسان کو تزکیہ نفس کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت ہے، ہر ایک گناہ سے اور فاحشہ سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر کوئی خیال دل میں گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع مغفرت سے کام لیتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان برے خیالات کو دل میں لا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے مدنظر تو یہی بات ہونی چاہئے کہ ہر ایک گناہ سے اور ہر ایک بد خیال سے بچے۔ لیکن اگر کمزوری سے کبھی کوئی خیال دل میں گزر جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں فرماتا۔ اور لَمَمٌ سے مراد یہاں خیال بد کا دل میں آنا ہی ہے، کیونکہ اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد ایسی مقاربت گناہ ہے جس میں فعل انسان سے کوئی سرزد نہیں ہوا۔ پھر اس کے ساتھ ہی تزکیہ کے لیے ایک اور اصول بتایا اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے قصور اور عاجزی کا معترف ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو پاک سمجھ لیتے ہیں وہ گناہ

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾	کیا تو نے اسے دیکھا جو پھر گیا؟
وَ اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّ اَكْدٰى ﴿۳۴﴾	اور تھوڑا سا دیا پھر رک گیا؟(3211)
اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾	کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھتا ہے؟
اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾	کیا اسے اس کی خبر نہیں ملی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے۔
وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾	اور ابراہیم کے جس نے وفا دکھلائی۔(3212)

سے بچنے کی کوشش ترک کر دیتے ہیں اور بدی کے مقابلہ کی کوشش کا چھوڑ دینا آخر انسان کو بدی کے سامنے عاجز اور کمزور کر دیتا ہے۔ یوں کمزوری کا اعتراف اصل میں قوت کا موجب ہے۔ اگلے رکوع میں اس سعی کے مضمون کو ہی جاری رکھا ہے۔ ﴿اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ سے بھی یہ ظاہر ہے کہ سارے انسان زمین سے ہی پیدا کیے جاتے ہیں۔

3211- ﴿اَعْطٰى﴾ اِعْطَاءٌ کسی چیز کا دینا ہے ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ﴾[التوبة: 29:9] ''یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں۔'' اور عَطِيَّةٌ۔ عَطَاءٌ صلہ یعنی بدلہ سے مختص ہیں۔ ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا﴾[ص: 39:38] ''یہ ہماری عطا ہے۔'' ﴿فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا﴾[التوبة: 58:9] ''سو اگر ان میں سے ان کو دے دیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں۔'' اور [اَعْطَى الْبَعِيْرُ] کے معنی ہیں اِنْقَادَ یعنی فرمانبردار ہو گیا گویا اس نے اپنا سر دے دیا اور انکار نہیں کرتا۔ (غ)

﴿اَكْدٰى﴾ كُدْيَةٌ زمین کی سختی ہے۔ کہا جاتا ہے [حَفَرَ فَاَكْدٰى] جب کھودتا ہوا ایسی زمین پر پہنچ جائے جو سخت ہے اور بطور استعارہ ایسے طالب کے لیے بولا جاتا ہے جو بے مراد واپس آ جائے اور ایسے دینے والے پر جو تھوڑا دے کر رک جائے۔ (غ)

تھوڑا دینے سے مراد یہاں تھوڑی فرمانبرداری کرنا ہی ہے اور مفسرین نے جن لوگوں کا ذکر اس کے شان نزول میں کیا ہے وہ ولید بن مغیرہ ہو یا نضر بن الحرث یا عاص بن وائل وہ سب اسی قسم کے لوگ تھے کہ اسلام کی طرف کچھ جھک کر رہ گئے اور یہ مرض آج بھی دنیا میں بہت ہے۔ اکثر لوگ چند باتوں میں ہاں میں ہاں ملانے کو تیار ہوتے ہیں، لیکن کسی کام پر پورا زور لگانے والے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اور اگلی آیت میں ﴿فَهُوَ يَرٰى﴾ سے مراد ہے کہ کیا وہ نتائج کو دیکھتا ہے؟

3212- ﴿وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾[البقرة: 124:2] ''اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند احکام سے آزمایا تو اس نے ان کو پورا کیا۔'' ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾﴾[البقرة: 131:2] ''جب اس کے رب نے اسے کہا فرمانبردار رہ، کہا میں جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہوں۔''

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔ (3213)

3213- **اصول سعی اور اس کا صحیح مفہوم:** یہ وہ زریں اصول ہے جس پر نہ صرف مذہب کا بلکہ کل دنیا کے کاروبار کا دارومدار ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے لیے آخرت میں کوئی نتیجہ پیدا ہو وہ یہاں کوشش کرے، جو شخص چاہتا ہے کہ اسے اس دنیا میں کچھ نتائج ملیں وہ یہاں کوشش کرے۔ ہاں جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے مل جاتی ہیں وہ بھی اس کی بعض صفات کا تقاضا ہے۔ مثلاً انسان کے لیے ہوا پیدا کر دی گئی، پانی پیدا کر دیا گیا اور اس میں اس کی کوشش کا کچھ دخل نہیں۔ مگر ان ہواؤں اور پانیوں سے اب جس قدر انسان اپنی سعی اور جدوجہد سے کام لیتا ہے اسی قدر فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اور اپنی رحمانیت سے ہمارے لیے قرآن بھیج دیا۔ لیکن یہ ہماری ترقی کا سامان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے۔ اس سامان سے جس قدر ہم اپنی سعی اور جدوجہد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اسی قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی موہبت بھی اسی انسان کو فائدہ دیتی ہے جو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ آج مسلمان اس اصول سے بالکل غافل ہیں اور سعی اور جدوجہد کا اصول نہ دنیا میں برتتے ہیں نہ دین میں۔ اقوام یورپ اسی اصول کو اپنی کتاب کی تعلیم کے خلاف دنیا میں کام میں لا کر فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

میت کو ثواب:

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جب انسان کے اعمال اس کی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتے ہیں تو پھر دوسرے کے اعمال کا بھی اس کو کوئی فائدہ ملتا ہے؟ ہم میت کے لیے نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ یہ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ میری ماں یکا یک فوت ہو گئی اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ بات کرتی تو صدقہ کرتی۔ تو کیا اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے اجر ملے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی اور وہ مر گئی۔ تو آپ نے فرمایا اگر اس پر قرضہ ہوتا تو کیا تو ادا کرتا؟ کہا ہاں۔ فرمایا پھر اللہ کا حق اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ادا کیا جائے اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین باتوں کے۔ ایک ولد صالح جو اس کے لیے دعا کرتا ہے، ایک صدقہ جاریہ جو اس کے بعد چلتا ہے، ایک علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور یہ باتیں فی الحقیقت اس کے اعمال میں ہی داخل ہیں۔ تو ان احادیث سے معلوم ہوا کہ دوسرے کے عمل سے بھی انسان کچھ نفع اٹھا لیتا ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ حدیثیں صاف بتاتی ہیں کہ یہ ایسے تعلق شدید کی صورت ہے کہ گویا عمل کرنے والا انسان اس دوسرے کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اور ایسے امور میں ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ جو امر

وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾	اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔ (3214)
ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾	پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔
وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾	اور کہ انجام تیرے رب کی طرف ہی ہے۔ (3215)
وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ﴿۴۳﴾	اور کہ وہی ہنساتا اور رُلاتا ہے۔

شریعت سے معلوم ہوتا ہے اسے اس قدر وسیع کریں کہ قیاس کرتے کرتے ایک نیا اصول قائم کرلیں۔ اسی لیے وہ لوگ جو اجرت دے کر قبروں پر کسی میت کی خاطر قرآن پڑھواتے ہیں ایسا طریق اختیار کرتے ہیں جو خلاف شریعت ہے، رسول اللہ ﷺ سے یہ بات ثابت نہیں۔ اور روح المعانی میں ہے کہ وہ قرآن پڑھنے والے تو صرف اجرت کی خاطر قرآن پڑھتے ہیں اس کا ثواب کسی کو کیا پہنچے گا۔ اور اسی طرح پر دعا کا فائدہ ایک مسلم امر ہے یعنی ہم کسی کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں جیسے جنازہ میں، تو اس کا فائدہ اسے پہنچتا ہے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی موہبت کے سامانوں میں سے ہے۔ کیونکہ وہ چاہے تو دعا کو قبول کرے اور چاہے نہ کرے۔ اور علاوہ ازیں دعا بھی خود سعی کے سامانوں میں سے ایک سامان ہے جس کا اثر اللہ تعالیٰ دوسروں پر بھی ڈال دیتا ہے اور یہی اصول مسئلہ شفاعت میں کام کرتا ہے۔

3214- ﴿سَوْفَ﴾ فعل مضارع کو استقبال کے لیے خاص کر دیتا ہے اور حال کے معنی سے الگ کر دیتا ہے۔ ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ﴾[یوسف: 98:12] ''میں اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔'' اور ﴿فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾[الأنعام: 135:6] ''پھر تم کو معلوم ہو ہی جائے گا۔'' میں یہ تنبیہ ہے۔ اگرچہ جو وہ طلب کرتے ہیں اس وقت موجود نہیں مگر وہ لامحالہ ہو کر رہے گا۔ (غ)

﴿يُرٰى﴾[اَرَيْتَهُ الشَّيْءَ] سے ہو سکتا ہے یعنی میں نے اسے وہ چیز دکھائی، گویا وہ کوشش اسے دکھائی جائے گی۔ پس وہ اس پر ظاہر ہو جائے گی۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر وہ کوشش ٹھیک حد تک پہنچی ہے تو مطلوبہ نتیجہ پیدا ہوگا، اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔

3215- ﴿اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾﴾ کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور وہی اعمال کے نتائج دینے والا ہے۔ اسی لیے آگے فرمایا کہ وہی خوشی اور غم دیتا ہے جو جس کا اہل ہے وہ اسے پہنچا دیتا ہے۔ وہی کسی کو مارتا ہے اور کسی کو زندہ کرتا ہے وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ منتہائے افکار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی مخلوق کے بارہ میں غور و فکر کام دیتا ہے نہ خالق میں۔ کیونکہ محدود محدود میں غور و فکر کر سکتا ہے، غیر محدود میں نہیں۔ اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں ایک سلسلہ علت و معلول کا ہے، ایک سبب ہے۔ ایک نتیجہ تو علت العلل ذات باری ہے اور یہ معنی بھی سیاق کے لحاظ سے موزوں ہیں۔ گویا بتایا یہ ہے کہ تمہارا پیدا کرنے والا وہی ہے جو علت العلل ہے۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْیَا ﴿۴۴﴾	اور کہ وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے۔
وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾	اور کہ وہی دو جوڑے پیدا کرتا ہے، نر اور مادہ۔
مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾	نطفہ سے جب وہ ڈالا جاتا ہے۔
وَ اَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾	اور کہ اسی پر دوسرا اٹھانا ہے۔
وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ﴿۴۸﴾	اور کہ وہی دولت دیتا ہے اور وہی پونجی دیتا ہے۔ (3216)
وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾	اور کہ وہی شعریٰ کا رب ہے۔ (3217)
وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾	اور کہ اس نے عاد اول کو ہلاک کیا۔
وَ ثَمُوْدَا فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾	اور ثمود کو، سو (انہیں) باقی نہ چھوڑا۔
وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ﴿۵۲﴾	اور نوح کی قوم کو اس سے پہلے (ہلاک کیا) کیونکہ وہ بڑے ظالم اور بڑے سرکش تھے۔
وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾	اور تباہ شدہ بستیوں کو دے مارا۔

3216- ﴿اَقْنٰى﴾ قِنْوَةٌ اور [قِنْيَهُ كَسْبَهُ] یعنی کمانے کو کہتے ہیں۔ اور [قَنَى الْمَالَ] کے معنی ہیں اس کو اپنے نفس کے لیے لیا۔ اور حدیث میں ہے [فَاَقْنُوْهُمْ] جس سے مراد ہے کہ انہیں علم سے قِنْيَةٌ دو جس سے وہ اپنا کام نکال لیں جب اس کی ضرورت ہو۔ اور [اَقْنَاهُ اللّٰهُ] کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا دیا جو اس کے لیے سکون اور اطمینان کا موجب ہوا۔ اور یہاں اَقْنٰى کے معنی اَرْضٰى بھی کیے گئے ہیں یعنی راضی کیا اور یہ بھی کہ اسے وہ دیا جسے بعد کفایت وہ ذخیرہ کرے۔ (ل) اور اس کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں [جَعَلَ لَهٗ قِنْيَةً مِنَ الرِّضَا وَالطَّاعَةِ] (غ) یعنی اسے اپنی رضا اور طاعت کا مال دیا۔

3217- ﴿الشِّعْرٰى﴾ ایک ستارہ کا نام ہے اور اس کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ ان کی ایک قوم اس کی عبادت کرتی تھی۔ (غ) اور یہ سخت گرمی کے موسم میں طلوع کرتا ہے اور جاہلیت میں بعض عرب اس کی عبادت کرتے تھے۔ (ل)

فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ سو انہیں ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ سو تو اپنے رب کی کن نعمتوں پر جھگڑتا ہے۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ یہ اگلے ڈرانے والوں میں سے ڈرانے والا ہے۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ آنے والی گھڑی آپہنچی۔ (3218)

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اللہ کے سوائے اسے کوئی دور کرنے والا نہیں۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ تو کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو۔

وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں۔

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ اور تم غافل ہو۔ (3219)

ع 3 30 7 فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ السجدة 12 سو اللہ کے لیے سجدہ کرو اور (اس کی) عبادت کرو۔ (3220)

3218- ﴿اَزِفَةُ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2903] اور یہاں مراد مخالفین کی تباہی اور ہلاکت ہے نہ قیامت کبریٰ۔ اس لیے کہ اول تو اوپر تمام قوموں کی ہلاکت کا ہی ذکر کیا ہے اور ﴿هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾﴾ کہہ کر صاف بتادیا کہ جس طرح وہ ہلاک ہوئے تم بھی ہلاک ہوگے۔ دوسرے اگلی آیت میں ہے ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾﴾ یعنی اللہ اسے دور کرسکتا ہے اور کوئی نہیں۔ حالانکہ قیامت کو اللہ تعالیٰ دور نہیں کرے گا۔ اس مشکل کی وجہ سے ﴿كَاشِفَةٌ﴾ کے معنی تاخیر ڈالنے والا بھی کیے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ یہاں ساعت وسطیٰ کا ذکر ہے یعنی قوم کی تباہی کا۔

3219- ﴿سٰمِدُوْنَ﴾ [سَامِدٌ لَا هِيَ] یعنی غافل کو کہتے ہیں جو اپنا سر اٹھائے ہوئے ہو۔ (غ)

3220- کفار کا سجدہ کرنا: بخاری میں ہے کہ سورۂ النجم پہلی سورت ہے جس میں سجدہ نازل ہوا، تو جب رسول اللہ ﷺ اسے پڑھ چکے تو آپ نے سجدہ کیا اور جو لوگ سننے والے تھے ان سب نے بھی سجدہ کیا یعنی کفار بھی سجدے میں شامل ہوئے سوائے امیہ بن خلف ہے، جس نے بجائے سجدہ کرنے کے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اس پر سجدہ کیا۔ سو یہ بعد میں کافر ہونے کی حالت میں قتل ہوا۔

اس سجدہ کو اس جعلی روایت کا مؤید سمجھا گیا ہے جس کا ذکر [نمبر: 3207] میں ہو چکا ہے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ یہ پہلی سورت ہے جس میں سجدہ نازل ہوا۔ کفار باوجود بت پرستی کے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل تھے اور بتوں کو صرف اس کی جناب میں سفارشی مانتے تھے۔ اس لیے جب آنحضرت ﷺ نے ﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا﴾ کہہ کر سجدہ کیا تو وہ بھی ساتھ ہی سجدہ میں گر گئے۔ یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں کہ اس پر یہ خیال کر لیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے چونکہ بتوں کی تعریف اس سورت میں کر دی تھی اس لیے کفار نے سجدہ کیا۔ اور یہ ممکن ہے کہ اسی سجدہ کرنے سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اب یہ مخالفت ترک کر دیں گے اور اسی کی شہرت حبش میں مہاجرین کو پہنچ گئی ہو، جس کی وجہ سے بعض لوگ واپس بھی آ گئے ہوں۔

اٰیَاتُهَا 55 (54) سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ (37) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ①

(وعدے کی) گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ (3221)

سورۃ القمر

نام:

اس سورت کا نام اَلْقَمَرِ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 55 آیتیں ہیں۔ اس کا نام اَلْقَمَرِ معجزہ شق القمر کے ذکر سے لیا گیا ہے جس سے اس سورت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس سورت میں صراحت کے ساتھ مخالفین مکہ کی طاقت کے خاتمہ کا ذکر ہے جس کا جنگ میں شکست کی صورت میں نمودار ہونا یہاں بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے اور چونکہ چاند اہل عرب کے لیے بطور نشان تھا اس لیے شق القمر کا معجزہ اور اس سورت کا نام اَلْقَمَرِ دونوں اس ایک ہی حقیقت کے اظہار کے لیے اختیار کیے گئے ہیں۔ اور اس سورت میں مختلف قوموں کی تکذیب انبیاء کی وجہ سے ان پر ہلاکت کے آنے کا ذکر کر کے آخر صاف بتایا کہ اسی طرح تم کافر اور مکذب لوگ بھی ہلاک ہو گے اور یہ بھی بتایا کہ قریش کی ہلاکت بذریعہ جنگ ہوگی اور یہ گویا سورت النجم کا تتمہ ہے۔ کیونکہ وہاں بھی کمالات نبوی کا ذکر کر کے آخر پر فرمایا تھا کہ آپ کی مخالفت کرنے والے ہلاک ہوں گے۔ اور ان دونوں کا تعلق ایسا شدید ہے کہ اس کا خاتمہ جن الفاظ پر کیا تھا ﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ﴾ انہی سے اس کی ابتدا کی ہے ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾۔ اور نام کا تعلق بھی ظاہر ہے اور نزول بھی ایک ہی زمانہ کا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بخاری کی روایت سے ظاہر ہے کہ میں چھوٹی سی تھی جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ﴾ [46]

3221۔ شق القمر پر روایات متواترہ: ابن اثیر واقعہ انشقاق قمر کے متعلق کہتے ہیں [وَ رَدَّ فِي الْاَحَادِيْثِ الْمُتَوَاتِرَةُ بِالْاَسَانِيْدِ الصَّحِيْحَةِ] یعنی اس کا ذکر متواتر حدیثوں میں اسناد صحیح کے ساتھ ہے۔ بخاری میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور ایک نیچے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گواہ رہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں صرف پھٹنے کا ذکر ہے، انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اہل مکہ نے نشان مانگا تھا تو آپ نے شق قمر کا معجزہ دکھایا اور ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ انہوں نے حرا کو ان دونوں کے درمیان

دیکھا۔ اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ ایک ٹکڑا اس پہاڑ پر تھا اور ایک اس پہاڑ پر یعنی صفا اور مروہ پر۔ طبرانی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ چاند کو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کسوف لگا تو کفار نے کہا چاند پر جادو کر دیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی اور کسی روایت میں ہے کہ ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے تھا اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ جب کفار نے شق قمر کو دیکھا تو کہا یہ ہم پر جادو کر دیا ہے، باہر سے آنے والوں سے دریافت کرو۔ دریافت کیا تو باہر سے آنے والوں نے بھی اس کی شہادت دی۔

ان تمام روایات سے جس نتیجہ پر ہم پہنچتے ہیں وہ اس حد تک یقینی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں انشقاق قمر دیکھا گیا یعنی چاند کا پھٹنا دیکھا گیا۔ لیکن باقی امور میں کہ دو ٹکڑے کہاں کہاں تھے روایات میں اتفاق نہیں۔ اور قصہ گویوں نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ یہ قصہ بھی بنالیا ہے جو کسی روایت میں نہیں کہ ایک ٹکڑا نبی ﷺ کی جیب میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا تھا۔ لیکن جہاں تک اصل واقعہ کا تعلق ہے ایک طرف احادیث اس بارہ میں تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور دوسری طرف قرآن کریم کے صریح الفاظ بھی اسی پر دال ہیں کہ انشقاق قمر وقوع میں آیا اور یہ بات کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس وقت پیدا نہ ہوئے تھے اور انس رضی اللہ عنہ چار سال کے تھے اور وہ ان حدیثوں کے راویوں میں سے ہیں، اصل واقعہ کو پایۂ اعتبار سے نہیں گرا سکتی۔ اس لیے کہ ان کے سوائے بھی ایک جماعت صحابہ کی ان روایات کو بیان کرتی ہے۔ اور معجزات کی تمام تاریخ میں کوئی معجزہ ایسی زبردست شہادت سے ثابت نہیں جیسے شق القمر کا معجزہ۔ اور یہ جو بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ انشقاق قرب قیامت میں وقوع میں آئے گا اور اس بنا پر انہوں نے اسے پیشگوئی قرار دیا ہے تو قیامت کے متعلق تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چاند باقی بھی رہے گا یا نہیں۔ اور یہ الفاظ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ سے غلطی لگی ہے۔ **ساعت سے مراد** یہاں قیامت کبریٰ نہیں بلکہ قریش کی یا مخالفین اہل عرب کی ہلاکت کی ساعت ہے جیسا کہ پچھلی سورت کے آخر پر ﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ﴾ سے مراد بھی وہی ساعت وسطیٰ تھی بلکہ ساعت سے یہ مراد قرآن کریم کی صراحت اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ [دیکھو نمبر: 3235] ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ﴾ [46] میں اسی ساعت کا ذکر ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اسے بدر کے دن پڑھنا بخاری سے ثابت ہے، صاف بتاتا ہے کہ اسی ساعت کا ذکر یہاں ہے۔

انشق القمر کے معنی اور معجزہ کے نیچے حقیقت: اور انشق القمر کے معنی جو [وَضَحُ الْاَمْرَ] کیے گئے ہیں (غ) تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کا امر واضح ہو گیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قمر یعنی چاند عرب کا نشان تھا جیسے سورج ایران کا نشان تھا اور اس کا انشقاق ان کی قوت کے ٹوٹنے کا نشان تھا۔ پس یہ معجزہ صرف بجائے خود ہی ایک نشان صداقت نبوت نہ تھا بلکہ اس کے نیچے ایک حقیقت بھی مخفی تھی۔ یعنی کہ ان لوگوں کی قوت رسول اللہ ﷺ کے مقابل میں توڑ دی جائے گی۔

انشقاق قمر کا وقوع خلاف قانون قدرت نہیں: رہا یہ کہ انشقاق قمر خلاف قانون قدرت ہے، تو یہ اعتراض اس قدر زبردست شہادت کے ہوتے ہوئے قابل توجہ نہیں۔ کسی قانون قدرت نے کوئی فیصلہ قطعی نہیں دے دیا کہ ان اجرام سماوی میں کوئی تغیرات یا بڑے بڑے انقلاب نمودار نہیں ہوتے رہتے، بلکہ قانون قدرت کی شہادت تو اس کے خلاف ہے۔ آخر زمین پر جو یہ اتنے بڑے بڑے پہاڑ بنے تو کیا یہ بغیر کسی انقلاب عظیم کے ہی بن گئے تھے اور خود سورج میں بڑے بڑے انقلاب آتے

وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲

اور اگر کوئی نشان دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں زبردست جادو ہے۔ (3222)

وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳

اور انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی، اور ہر کام (اپنے وقت پر) قرار پکڑنے والا ہے۔ (3223)

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴ۙ

اور یقیناً انہیں وہ باتیں پہنچ چکی ہیں، جن میں تنبیہ ہے۔

رہتے ہیں اور بعض وقت بڑے بڑے داغ نمودار رہتے ہیں جنہیں ظاہر آنکھ بھی دیکھ سکتی ہے۔ تو یہ کون سی بعید بات ہے کہ کوئی عظیم الشان انقلاب چاند کے اندر نمودار ہوا، جس نے انشقاق کی کیفیت اس کے اندر پیدا کر دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی قوت اعجازی کے اظہار کے لیے یہ تغیر عظیم ان لوگوں کو بھی دکھا دیا جو آپ سے نشان مانگتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی قوت کشفی بعض وقت اس قدر زبردست ہوتی ہے کہ دور کی چیزیں انہیں پاس نظر آتی ہیں اور اس قوت کشفی کا اثر بعض وقت دوسرے لوگوں پر بھی اعجازاً ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اس نظارہ میں شریک ہو جائیں۔ صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دو ٹکڑے الگ الگ دیکھنے بیان کیے گئے ہیں۔ سو یہ سب روایات میں نہیں بعض روایات میں ہے اور ان میں بھی باہم اختلاف ہے۔ اور یہ بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس **انشقاق کے وقت چاند کو گرہن** بھی لگا تھا۔ جیسا کہ ایک روایت میں صاف الفاظ بھی ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ بعض بزرگوں نے انشقاق کو خاص قسم کا خسوف ہی قرار دیا ہے۔ غالباً وہ گرہن نصف چاند کا تھا یعنی نصف تاریک ہو گیا اور نصف روشن رہا۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ ٹکڑوں کا ذکر الگ الگ بعض روایات میں آتا ہے۔

3222۔ ﴿مُسْتَمِرٌّ﴾۔ [اِسْتَمَرَّ الشَّیْءَ] کے معنی ہیں ایک چیز ایک طریقہ پر ہوتی چلی گئی اور [اِسْتَمَرَّ الشَّیْءَ] کے معنی ہیں اس کے اٹھانے پر مضبوط ہو گیا۔ اور [اِسْتَمَرَّ مَرِیْرَہٗ] کے معنی ہیں اس کا عزم مستحکم ہو گیا اور ﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ﴾ [الاعراف: 189:7] ''تو وہ ایک ہلکا سا بوجھ اٹھا لیتی ہے۔'' میں مراد **اِسْتَمَرَّتْ** ہے یعنی اپنی عادت کے مطابق بیٹھتی اٹھتی رہی ہے اور اس کے بوجھ کو محسوس نہیں کیا اور کسی شخص کا کام جب فساد کے بعد مضبوط ہو جائے تو کہا جاتا ہے **اِسْتَمَرَّ** اور ہر چیز کو **مُسْتَمِرٌّ** کہا جاتا ہے جس کی روشنی منقاد ہو گئی ہو۔ (ل) اور یہاں **مُسْتَمِرٌّ** کے معنی **ذَاهِبٌ** بھی کیے گئے ہیں۔ یعنی ایسا جادو جو گزر جائے گا اور سحر شدید بھی یعنی سخت جادو۔ (ج)

3223۔ ﴿مُسْتَقِرٌّ﴾ یعنی قرار پکڑنے والا۔ **اِسْتَقَرَّ** سے جس کے معنی ہیں ایک چیز نے قرار پکڑا یا مضبوط ہو گئی۔ اور ﴿كُلُّ اَمْرٍ﴾ سے مراد ہر امر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ کیونکہ پہلے ایک امر اللہ کی تکذیب کا ذکر ہے تو قانون کو عام کر کے بتایا ہے کہ

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵

کامل دانائی (کی باتیں) مگر ڈرانا کسی کام نہ آیا۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶

سو ان کی پروانہ کر، جس دن بلانے والا ایک سخت چیز کی طرف بلائے گا۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝۷

ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، قبروں سے نکل پڑیں گے گویا کہ وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸

پکارنے والے کی طرف دوڑے جاتے ہوں گے۔ کافر کہیں گے یہ تنگی کا دن ہے۔ (3224)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝۹

ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا۔ سو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا دیوانہ اور (اسے) ڈانٹا گیا۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰

سو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں تو میری مدد فرما۔

ہر امر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو ضرور ہے کہ وہ قائم اور ثابت ہو کر رہے۔

3224۔ ﴿يَوْمٌ عَسِرٌ﴾ اور ﴿يَوْمٌ عَسِيْرٌ﴾ وہ ہے جس میں امر مشکل ہو جائے ﴿يَوْمٌ عَسِيْرٌ﴾ [المدثر: 9:74] ''ایک مصیبت کا وقت ہوگا۔'' ﴿وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا﴾ [الفرقان: 26:25] ''اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔'' (غ) بلاشبہ یہ لفظ قیامت پر بھی صادق آسکتے ہیں لیکن جس چیز کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے وہ وہی ساعت وسطیٰ ہے یعنی مکذبین کی ہلاکت کا وقت نہ قیامت کبریٰ۔ اسی سے اعدائے حق کو بار بار ڈرایا جاتا تھا اور اسی لیے جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ پہلی قوموں کی ہلاکت کی ہیں جیسے آگے نوح علیہ السلام کی قوم کا اور اس کے بعد عاد، ثمود وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ اور دَاعِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور ﴿شَيْءٍ نُّكُرٍ﴾ کی

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾

پس ہم نے بادل کے دروازے زور سے برستے ہوئے پانی سے کھول دیئے۔ (3225)

وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾

اور زمین میں چشمے بہا دیئے۔ تو پانی ایک کام کے لیے جمع ہوگیا جس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ (3226)

وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴿۱۳﴾

اور ہم نے اسے تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا۔ (3227)

تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾

اور وہ ہمارے سامنے چلتی تھی۔ یہ اس شخص کو بدلہ دیا گیا جس کا انکار کیا گیا۔

وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾

اور ہم نے اسے نشان (کے طور پر) چھوڑا تو کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے۔

طرف آپ کا بلانا یہی تھا کہ ان لوگوں کو جو آپ کو دنیا سے نابود کرنے کے درپے تھے آخر آپ کی اطاعت اختیار کرنی پڑی۔ اور ﴿اَجْدَاثٍ﴾ سے مراد مجازاً اُن کے گھر ہیں جو بوجہ فقدان روحانی زندگی قبروں سے مشابہ ہیں۔

3225۔ ﴿مُّنْهَمِرٍ﴾۔ هَمْرٌ آنسوؤں اور پانی کا بہنا ہے اور اِنْهِمَارٌ کے معنی ہیں بہا۔ (غ) اور مینہ کے برسنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ل)

3226۔ طوفان نوح میں التقاء ماء سے مراد: ﴿فَالْتَقَى الْمَآءُ﴾ یہاں مفسرین نے مَآءٌ کی جگہ مَآءَيْنِ یعنی دو پانی لیے ہیں۔ یعنی ایک اوپر سے، بادل سے پانی برستا تھا اور دوسرا نیچے سے، زمین سے پھوٹتا تھا اور یہ دونوں پانی جمع ہو گئے۔ بالفاظ دیگر پانی اوپر یہاں تک چڑھ گیا کہ بادلوں کو جا ملا۔ ایسا ہو جانا قدرت خداوندی سے تو کچھ بعید نہیں۔ مگر یہاں صرف مَآءٌ ہے اور دو پانیوں کا ذکر نہیں اور پانی کے اِلْتِقَاءٌ سے مراد پانیوں کا اکٹھا ہونا ہے اور ﴿اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ﴾ میں اشارہ ہے قوم نوح کی ہلاکت کی طرف۔ اور ایک قوم کی ہلاکت کے لیے بادلوں تک پانی پہنچانے کی ضرورت بھی نہیں۔

3227۔ ﴿اَلْوَاحٍ﴾۔ لَوْحٌ کشتی کے تختہ کو کہا جاتا ہے اور اسے بھی جس پر لکھا جاتا ہے یعنی تختی کو ﴿وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ﴾ [الاعراف: 145:7] ''اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں فرض کر دی۔'' اور لوح محفوظ کی کیفیت ہم پر مخفی ہے، سوائے اس قدر کے جو

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾

سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟(3228)

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۸﴾

عاد نے جھٹلایا، تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾

ہم نے ان پر ایک آندھی ایک سخت نحوست والے دن میں چلائی۔

تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾

وہ لوگوں کو یوں اکھاڑ پھینکتی تھی گویا کہ وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔(3229)

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾

سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ ع 1 22 8

اور یقیناً ہم نے نصیحت کے لیے قرآن کو آسان کر دیا۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾

ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔

احادیث میں ذکر آ گیا ہے۔ (غ)

﴿دُسُرٍ﴾۔ دِسَارٌ کی جمع ہے میخ کو کہتے ہیں اور دَسْرٌ کے اصل معنی ہیں زور سے کسی چیز کا دھکیلنا۔ (غ) تختیوں اور میخوں سے بنی ہوئی چیز یعنی کشتی پر سوار کیا۔

3228۔ ﴿نُذُرِ﴾۔ نُذُرٌ کی جمع بھی ہے اور اِنْذَارٌ سے اسم بھی ہے اور اسی طرح نذیر بھی اسم ہے ﴿كَيْفَ نَذِيْرِ﴾ [الملك: 17:67] ''میرا ڈرانا کیسا تھا۔'' اور ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا﴾ [المرسلات: 6:77] ''عذر کے لیے یا ڈرانے کو۔'' بھی بمعنی مصدر ہی ہے۔ (ل)

3229۔ ﴿اَعْجَازُ﴾۔ عِجْزٌ یا عُجُزٌ کی جمع ہے۔ ہر چیز کے مؤخر یا اس کی اصل کو کہتے ہیں۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۲۴﴾

سو انہوں نے کہا کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک انسان کی پیروی کریں۔ تو اس صورت میں ہم گمراہی اور دکھ میں ہوں گے۔ (3230)

ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾

کیا ہمارے درمیان میں سے اسی پر نصیحت اُتری ہے بلکہ وہ جھوٹا خود پسند ہے۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾

کل کو جان لیں گے کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔ (3231)

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾

ہم اونٹنی کو ان کی آزمائش کے طور پر بھیجنے والے ہیں۔ سو انہیں دیکھتا رہ اور صبر کر۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾

اور انہیں خبر دے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہوا ہوا ہے۔ ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔ (3232)

﴿مُّنْقَعِرٍ﴾۔ قَعِرٌ کسی چیز کی نہایت اسفل یعنی گہرائی کو کہتے ہیں اور ﴿مُّنْقَعِرٍ﴾ کے معنی دو طرح کیے گئے ہیں۔ زمین کی گہرائی میں جانے والا اور اپنے قعر یعنی جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا ہوا۔ (غ)

3230۔ ﴿سُعُرٍ﴾۔ سُعُرٌ اور سُعُرٌ کے معنی جنون ہیں اور یہ ان کی دنیوی حالت کا ذکر ہے اور ﴿سُعُرٍ﴾ یہاں سَعِيْرٌ (دوزخ) کی جمع نہیں۔ اور فراء کے نزدیک اس کے معنی عذاب اور مصیبت ہیں یا مراد یہ ہے کہ ایسے امر میں ہیں جو ہمیں جلاتا ہے یا یہ کہ اس کا نتیجہ آگ یا جلن ہے۔ (ل)

3231۔ ﴿اَشِرٌ﴾۔ شدت بطر ہے یعنی بہت خود پسندی یا اترانا۔ اور یہ وہ خوشی ہے جو ہوائے نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ (غ) اور اَشِرًا اترنے والا۔

3232۔ ﴿مُحْتَضَرٌ﴾۔ اِحْتَضَرَ۔ حَضَرَ سے ہے اور عرب کے لوگ کہتے ہیں [اَللَّبَنُ مُحْتَضَرٌ وَ مَحْضُوْرٌ نَغَطِّهٖ] دودھ محتضر ہے پس اسے ڈھانک کر رکھو۔ تو ﴿مُحْتَضَرٌ﴾ سے مراد ہے کہ اس پر جن چارپائے وغیرہ آجاتے ہیں۔ گویا وہ کثیر الآفات ہے اور [اُحْتُضِرَ فُلَانٌ] کے معنی ہیں اس کی موت آموجود ہوئی اور جنون والے کو بھی ﴿مُحْتَضَرٌ﴾ کہا جاتا ہے۔ (ل) اور یہاں مراد ہے [يَحْضُرُهُ اَصْحَابُهُ] (غ) یعنی اس کے اصحاب اس پر موجود ہوتے ہیں۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾

پس انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا سو اس نے ہاتھ بڑھایا اور (اسے) مار دیا۔ (3233)

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾

تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾

ہم نے ان پر ایک ہی آواز بھیجی، سو وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح چورا ہو گئے۔ (3234)

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾

اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور پانی کا قصہ: ﴿اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ﴾ کے معنی یوں کیے گئے ہیں کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور پھر اس سے یہ قصہ بنایا گیا ہے کہ ایک دن اونٹنی سارا پانی پی جاتی تھی اور لوگوں کو اس دن پانی نہ ملتا تھا۔ حالانکہ یہ ذکر قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ اور پھر یہاں پانی کی تقسیم ان میں آپس کے اندر ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو چراگاہ اور پانی سے نہ روکا جائے۔ چراگاہ کے متعلق دوسری جگہ ذکر ہے ﴿فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ﴾ [هود: 64:11] ''سو اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرے۔'' اور یہاں پانی کے متعلق فرمایا کہ پانی تم میں تقسیم شدہ ہے اس لیے کہ یہ علاقہ پہاڑی تھا۔ اور جب کافی بارشیں نہ ہوں تو ایسے علاقوں میں پانی کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ تو مطلب یہ تھا کہ تم نے تو آپس میں پانی کے حصے کیے ہوئے ہیں، لیکن اس وجہ پر صالح کی اونٹنی کو پانی سے نہ روکا جائے گا۔ خواہ باری ایک فریق کی ہو یا دوسرے کی۔

3233۔ ﴿تَعَاطٰى﴾۔ عَطَا سے ہے [تَعَاطَى الشَّيْءَ] کے معنی ہیں تَنَاوَلَهُ اسے لیا اور ﴿تَعَاطٰى﴾ اس چیز کا لینا جس کا لینا درست نہیں اور کسی چیز پر جرأت کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور یہاں معنی کیے گئے ہیں [تَعَاطَى عَقْرَ النَّاقَةَ] یعنی ناقہ کے مارنے کو لیا اور یا اس کے معنی ہیں جرأت کی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی صفت میں ہے [وَإِذَا تَعَاطَى الْحَقَّ، لَمْ يَعْرِفْهُ أَحَدٌ] (شُعَبُ الْإِيمَانِ لِلْبَيْهَقِيِّ، فَصْلٌ فِيْ خُلُقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ فِيْ خُلُقِهٖ) یعنی آنحضرت ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے اخلاق سے پیش آتے تھے، جب تک کوئی حق ضائع نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اگر دیکھتے کہ کسی کا حق باطل کیا گیا ہے تو آپ بالکل متغیر ہو جاتے۔ گویا وہ لوگ آپ کو نہ پہچانتے جو آپ کو جانتے تھے۔ (ل)

3234۔ ﴿مُحْتَظِرِ﴾۔ حَظِيْرَةٌ باڑ کو کہتے ہیں اور ﴿مُحْتَظِرِ﴾ باڑ کا لگانے والا۔ (غ) اور ﴿هَشِيْمِ﴾ [دیکھو نمبر: 1925] پتوں وغیرہ کو

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾

لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۙ﴿۳۴﴾

ہم نے ان پر پتھر برسائے، سوائے لوط کے لوگوں کے۔ انہیں ہم نے صبح کے وقت بچالیا۔

نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾

(یہ) ہماری طرف سے نعمت (تھی) اسی طرح ہم اسے بدلہ دیتے ہیں جو شکر کرتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾

اور اس نے انہیں ہماری گرفت سے ڈرایا تھا۔ پر انہوں نے ڈرانے میں جھگڑا کیا۔

وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾

اور انہوں نے اس کے مہمانوں کو لے جانا چاہا۔ پس ہم نے ان کی آنکھیں بند کر دیں، سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا چکھو۔

وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۚ﴿۳۸﴾

اور ایک قائم رہنے والے عذاب نے انہیں صبح کے وقت آلیا۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾

سو میرا عذاب اور میرا ڈرانا چکھو۔

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ ع 2 18 9

اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۚ﴿۴۱﴾

اور فرعون کے لوگوں کے پاس بھی ڈرانے والے آئے۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

انہوں نے ہمارے سب نشانوں کو جھٹلایا، سو ہم نے انہیں (ایسا ہی) پکڑا (جیسا) غالب قدرت والے کا پکڑنا (ہوتا ہے)۔

کہتے ہیں جو بالکل چورا ہو گئے ہوں۔ اس لیے ﴿كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ باڑ لگانے والے جب خشک ٹہنیوں وغیرہ کو اکٹھا کر کے باڑ لگاتا ہے تو پتے وغیرہ گر کر چورا ہو جاتے ہیں۔ ان سے مثال دینے میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿٤٣﴾

کیا تمہارے کافر ان سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے صحیفوں میں بریت (لکھی ہوئی) ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿٤٤﴾

کیا کہتے ہیں کہ ہم ایک جمعیت ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہیں۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾

(یہ) جمعیت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿٤٦﴾

بلکہ (موعود) گھڑی ان کا وقت مقرر ہے اور وہ گھڑی بہت مصیبت والی اور بہت تلخ ہے۔ (3235)

ان کی کچھ قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ تھی۔

3235۔ ﴿اَدْهٰى﴾۔ [دَهُوْرَا وَ رَدْهَاءُ] عقل ہے اور دَاهِيَةٌ بڑے امر منکر کو کہتے ہیں۔ (ل) ﴿اَمَرُّ﴾۔ مَرَارَةٌ ضد حلاوت ہے اور مُرٌّ، حُلْوٌ کی یعنی تلخ۔

آنحضرت ﷺ کا جنگ کو الساعۃ قرار دینا: بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بدر کے دن ایک خیمہ میں تھے اور دعا کر رہے تھے [اَللّٰهُمَّ أَسْئَلُكَ وَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ، اَللّٰهُمَّ إِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ أَبَدًا] (صحيح البخارى، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ: بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ: 4877)

''اے اللہ! میں تجھ سے چاہتا ہوں کہ اپنا عہد اور اپنا وعدہ پورا فرما۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے دن کے بعد تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا'' (یعنی اگر یہ مٹھی بھر مسلمان کفار کے ہاتھ سے مارے گئے) تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! بس کیجئے۔ اپنے رب سے دعا کرنے میں آپ نے حد درجہ کا زور لگایا ہے، اور آپ اس وقت زرہ پہنے ہوئے تھے۔ پس آپ نکلے اور آپ پڑھ رہے تھے ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿٤٦﴾﴾ یعنی یہی آیات اور عکرمہ کی ایک روایت میں ہے کہ جب ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ﴾ نازل ہوئی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کون سی جمعیت شکست کھائے گی اور کون سی جمعیت مغلوب ہوگی۔ تو عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب بدر کا دن آیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو زرہ پہنے ہوئے دیکھا اور آپ پڑھ رہے تھے ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ تو اس دن اس کے معنی مجھے سمجھ آئے۔ اور بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور میں اس وقت چھوٹی سی لڑکی تھی جو کھیلا کرتی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ قتادہ، عکرمہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے کہ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ﴾ یوم بدر کے متعلق ہے۔

وقف لازم

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٤٧﴾

بیشک مجرم گمراہی اور دکھ میں ہیں۔

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾

جس دن آگ کے اندر اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔ دوزخ کا چھو جانا چکھو۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾

ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے پر پیدا کیا ہے۔ (3236)

وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾

اور ہمارا حکم تو ایک ہی ہے (یوں آجائے گا) جیسے آنکھ کا جھپکنا۔

جنگ بدر کی پیشگوئی کی عظمت: ان روایات سے بصراحت ثابت ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے ان آیات کو بدر کی جنگ پر چسپاں کیا اور اس لیے ﴿اَلسَّاعَةُ﴾ سے مراد یقیناً قریش کی ساعت وسطیٰ یعنی ان کی ہلاکت کی گھڑی ہے نہ قیامت کبریٰ۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ یہ آیت مکہ میں پانچویں چھٹے سال بعثت میں نازل ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا ابھی بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اور جب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کبھی اتنے آدمی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ کفار کے بالمقابل جنگ میں نکلیں اور پھر کفار کی جمعیت کو جو سب ایک دوسرے کی مدد پر تلے ہوئے تھے ﴿نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ﴾ شکست دے سکتے ہیں۔ ایسے حالات جب کوئی بات بھی نہ سنتا۔ یہ کھلی پیشگوئی کہ مسلمانوں اور کفار میں جنگ ہوگی اور اس جنگ میں کافر شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قدرت اور علم غیب کا پتہ دیتی ہے اور خدا کی ہستی پر وہ ایمان پیدا کرتی ہے جس کے سامنے تمام دنیا کے علوم عاجز ہیں اور معجزات میں بھی کوئی معجزہ اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ یہ وہ حقیقت تھی جو شق القمر کے معجزہ کے نیچے تھے اور اس لیے سورت کی ابتدا ﴿اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانشَقَّ الْقَمَرُ﴾ سے کر کے یہاں صاف کر دیا کہ وہ ساعت جس کے قریب آنے کا نشان ظاہری شق القمر تھا ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ کی ساعت ہے اور یوں آخر اس پیشگوئی نے پورا ہو کر شق القمر کی صداقت بھی ظاہر کر دی۔

3236۔ ہر چیز کو ایک اندازہ پر پیدا کیا ہے، عام قانون ہے جو بار ہا بیان ہو چکا ہے۔ یہاں مخالفین حق کی ہلاکت کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے اور اسی کا ذکر اس میں مقصود ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر چلتا ہے اور آگے بھی یہی ذکر چلتا ہے۔ ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ﴾ مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اپنے اندازہ سے نہیں بڑھ سکتے اور جب ان کا وقت آجائے گا تو ان کی صف بھی لپیٹ دی جائے گی۔ اور اسی کی طرف اشارہ ﴿مَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ﴾ میں ہے۔ اور حکم کے ایک ہونے کا منشا یہ ہے کہ اسے کوئی ٹال نہیں

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾

اور ہم تم جیسوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

وَ كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾

اور ہر ایک بات جو انہوں نے کی ہے صحیفوں کے اندر ہے۔ (3237)

وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾

اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی (بات) لکھی ہوئی ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ﴿۵۴﴾

متقی باغوں اور فراخی میں ہوں گے۔

ع 3 15 10 فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

راستی کے مقام میں، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

سکتا اور نہ ہی وہ اپنی قوت و طاقت میں کوئی نظیر رکھتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 201] اور اسے آتے دیر نہیں لگتی۔

3237۔ ﴿الزُّبُرِ﴾ یا صحیفوں سے مراد یہاں نامہ ہائے اعمال ہیں جہاں ہر کام چھوٹا ہو یا بڑا لکھا جاتا ہے۔

اٰیَاتُهَا 78 (55) سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ (97) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ — رحمٰن نے،

عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ — قرآن سکھایا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ — انسان کو پیدا کیا۔

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ — اسے بولنا سکھایا۔ (3238)

سورۃ رحمٰن

نام:

اس سورت کا نام اَلرَّحْمٰنُ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 78 آیتیں ہیں۔ اس کا نام اَلرَّحْمٰنُ پہلی آیت میں ہی مذکور ہے جہاں بتایا ہے کہ قرآن کریم کا بھیجا جانا بتقاضائے صفت رحمانیت ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری نعمتوں کے لیے ہر قسم کے سامان دنیا میں پیدا کر رکھے ہیں، مگر پھر ایک وہ انسان ہیں جو ان سامانوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکھ اٹھاتے ہیں اور دوسرے جو ان سامانوں سے کام لیتے ہیں اور راحت حاصل کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی باطنی نعمت کا سامان قرآن کریم میں دنیا کو دے دیا ہے۔ پھر ایک وہ لوگ ہیں جو قرآن سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو اس کا نتیجہ بھی یہ ہے کہ دنیا میں روحانی طور پر اور آخرت میں کھلے طور پر دکھ اٹھاتے ہیں اور مومن جو ان سامانوں کو کام میں لاتے ہیں وہ دنیا میں روحانی طور پر اور آخرت میں کھلے طور پر جنت حاصل کرتے ہیں۔ یہی مضمون اس سورت کا ہے اور پچھلی سورت سے تعلق ظاہر ہے۔ اور یہ سورت بھی مکی ابتدائی زمانہ کی ہے۔

3238- ﴿بَيَانٌ﴾ [دیکھو نمبر: 522] کسی چیز کی حالت کا ظاہر کرنا بیان ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ بیان دو طرح پر ہے۔ ایک حالت سے یعنی یہ کہ بعض اشیاء اپنی بناوٹ کے آثار سے کسی حالت پر دلالت کریں اور دوسرا خبر کے ذریعہ سے۔ اور یہ کبھی نطق یعنی بات کرنے سے اور کبھی کتابت یعنی لکھنے سے اور کبھی اشارہ سے ہوتا ہے۔ حالت سے بیان کی مثال ہے ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ جو شیطان کے متعلق ہے یعنی اس کا دشمن ہونا۔ حالت سے ظاہر ہے اور کلام کو بیان کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس سے معنی

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵ سورج اور چاند کے حساب کے پابند ہیں۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶ اور بوٹیاں اور درخت سجدے کرتے ہیں۔ (3239)

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷ اور آسمان کو بلند کیا اور میزان کو قائم کیا۔ (3240)

مقصود کا اظہار ہوتا ہے اور جس چیز کے ساتھ اجمال و ابہام کلام کی تشریح کی جائے اسے بھی بیان کہا جاتا ہے۔ جیسے ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾[القيامة: 19:75] ''ہمارے ذمہ اس کا کھول کر بتانا ہے۔''

پہلی دو آیتوں میں قرآن کے سکھانے کا ذکر ہے اور دوسری دو میں بیان کے سکھانے کا۔ اور یہ دونوں باتیں رحمٰن نے سکھائی ہیں یعنی اس کی صفت رحمانیت کا تقاضا ہیں اور انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں۔ اور ابتدا قرآن سے کی گویا اسی کو **سب سے بڑی نعمت** قرار دیا اور اس سورت میں ذکر نعمتوں کا ہی ہے اور حق بھی یہی ہے کہ اس لیے کہ اسی نے انسان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں اس کے لیے ہیں۔ اور بیان سکھانے سے جیسا کہ اس سے پہلے ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾ سے ظاہر ہے، مراد یہ ہے کہ اسے اظہار خیالات کرنے کا طریق سکھایا۔ اور نطق کی بجائے بیان کا لفظ اس لیے اختیار کیا کہ نطق صرف گویائی ہے، مگر بیان میں نطق، تحریر اور اشارات سب آجاتے ہیں۔ اور انسان یہاں عام ہے۔

3239- بڑے بڑے اجرام سماوی ایک طرف، چھوٹی چھوٹی بوٹیاں اور درخت دوسری طرف۔ سب کے سب ایک قانون میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور جکڑنے والے کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور بایں یہ چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالنے والی ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان **سب کا بنانے والا ایک** ہی ہے۔ سورج اور چاند کے اثر سے چھوٹی چھوٹی بوٹیاں اور درخت نشوونما پاتے ہیں۔ اس مخلوق میں ایک عظیم الشان ربط موجود ہے، اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر وہ خدا جو ان تمام چیزوں کو ایک قانون میں رکھ کر کمال پہنچاتا کیا اس نے انسان کے کمال کو پہنچنے کے لیے کوئی قانون نہیں بتایا۔ اسی کا ذکر اگلی آیت میں لفظ میزان میں ہے۔

3240- **میزان اجرام سماوی:** ﴿اَلْمِيْزَانَ﴾ کے معنی عدل ہیں۔ (ل) نیز [دیکھو نمبر: 1050] اور یہاں بھی مجاہد سے عدل ہی معنی مروی ہیں۔ (ج) اور یہ وہ میزان یا عدل ہے جو تمام اجرام سماوی میں قائم کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا ذکر رفع سماء کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی وہ قانون جس کی وجہ سے یہ تمام سلسلہ ایک نظم میں منسلک ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لے کر ان بڑے سے بڑے اجرام سماوی تک جن کے سامنے یہ ساری زمین بھی ایک چھوٹے سے گیند سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی سب ایک قانون کے ماتحت چلتے ہیں۔ تو جس طرح یہ ایک میزان ظاہری ہے، اسی طرح انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک میزان دی ہے جس سے اس کا نظام صحیح طور پر قائم رہ سکتا ہے۔ یہ میزان اخلاق کے لیے ﴿وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾[الحديد: 25:57] ''اور اس کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری۔'' اور اسی کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ گویا ظاہری میزان سے جو مخلوقات کے اندر کام کر رہی ہے اسی **باطنی میزان** کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر انسان کے اخلاقی اور روحانی نظام کا مدار ہے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿٨﴾	تاکہ تم میزان میں سرکشی نہ کرو۔
وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿٩﴾	اور وزن کو انصاف سے قائم کرو اور تول میں کمی نہ کرو۔
وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿١٠﴾	اور زمین کو مخلوق کے لیے رکھا۔ (3241)
فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ النَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿١١﴾	اس میں پھل ہے اور گابھوں والی کھجوریں۔
وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾	اور بھس والا دانہ اور خوشبودار پھول۔ (3242)
فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٣﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (3243)

3241- ﴿لِلْاَنَامِ﴾ اَنَامِ وہ ساری مخلوقات ہے جو زمین پر ظاہر ہے۔ اور مفسرین کہتے ہیں کہ ﴿لِلْاَنَامِ﴾ سے مراد جن اور انسان ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد جَآنّ اور انسان کا ذکر کیا ہے اور جِنّ کا ذکر اس سے پہلے کوئی نہیں۔ (ل) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی [كُلُّ شَيْءٍ فِيْهِ الرُّوْحِ] مروی ہیں، یعنی تمام چیزیں جن میں روح ہے۔ اور حسن سے جن و انس اور مجاہد اور قتادہ اور ابن زید سے کل مخلوق۔ (ج) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک اور روایت میں ہے کہ اس سے بنی آدم مراد ہیں۔ (ر) اور انتفاع تام انسان کے لیے ہی ہے۔

3242- ﴿الرَّيْحَانُ﴾ وہ ہے جس کے لیے رَائِحَةٌ یعنی خوشبو ہو اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی رزق ہیں۔ پھر اس دانہ کو جو کھایا جاتا ہے رَيْحَانٌ کہا جاتا ہے۔ ایک اعرابی کو کہا گیا تو کہا جاتا ہے جواب دیا [اَطْلُبُ مِنْ رَيْحَانِ اللّٰهِ] یعنی میں اللہ کے رزق سے طلب کرتا ہوں اور اولاد کو بھی رَيْحَانٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں رَيْحَانٌ آیا ہے اس سے مراد رزق ہے اور یہی معنی مجاہد سے مروی ہیں۔ اور ابن زید کا قول ہے کہ نبات سے ہر خوشبو والی شے مراد ہے۔ (ج) اور میرے نزدیک رَيْحَانٌ سے مراد یہاں خوشبودار نبات ہی ہیں اور بتانا یہ مقصود ہے کہ کیسی کیسی عجیب چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے زمین سے پیدا کی ہیں۔ ایک طرف اگر پھل ہیں تو دوسری طرف دانہ ہے، جس کے ساتھ جانوروں کے لیے بھوسہ بھی ہوتا ہے۔ پھر ان سب سے بڑھ کر لطیف چیز خوشبودار پھول، جو گو انسان کے کھانے کے کام میں نہ آئے مگر اس کی راحت کے عجیب ترین سامانوں میں سے ہے اور اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

3243- تثنیہ کا استعمال جن و انس کے خطاب کی وجہ سے سمجھا گیا ہے اور گو اس میں شک نہیں کہ جن بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے اور

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾

اس نے انسان کو ٹھیکری جیسی سوکھی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ (3244)

وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾

اور جنوں کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ﴿۱۷﴾

وہ دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب ہے۔ (3245)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ﴿۱۹﴾

اسی نے دو دریا چلائے ہیں جو باہم ملتے ہیں۔

انسان کی طرح وہ بھی ناشکر گزاری کرنے والے ہیں، اس لحاظ سے دونوں کو خطاب صحیح ہوسکتا ہے۔ لیکن اول تو اوپر جنوں کا ذکر نہیں کہ انہیں خطاب میں شامل سمجھا جائے اور دوسرے جن نعمتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان سب سے انسان ہی فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ مثلاً پھل اور دانہ اور موتی اور کشتیاں وغیرہ۔ اس لیے یا تو انسانوں کے دو گروہ مراد ہوسکتے ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں اکثر آتا رہتا ہے یعنی مومن اور کافر یا بڑے اور چھوٹے یا اہل مشرق اور اہل مغرب کہ یہ بھی بڑی بھاری تقسیم دنیا میں ہوئی ہے۔ یا سپید اور غیر سپید اور یا تثنیہ کا استعمال محض تاکید کے لیے ہو۔ [دیکھو نمبر: 3144] اور اس فقرہ کا بار بار دہرانا اس کی عظمت کے لیے ہے۔ اور یہ اسلوب کلام ہے کہ جس بات کی بہت تاکید منظور ہو اسے بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس کی مثالیں عرب کے شعراء میں بکثرت موجود ہیں۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سورت کے پڑھتے وقت صحابہ کو فرمایا کہ اس آیت کے پڑھا جانے پر بارگاہ الٰہی میں یوں عرض کریں: [لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ] (سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب وَمِنْ سُورَةِ الرَّحْمٰنِ، حدیث 3602) (ر)

3244- ﴿كَالْفَخَّارِ﴾ گھڑے کو کہا جاتا ہے بوجہ اس کی آواز کے جو گویا کثرت فخر کرنے والے سے مشابہ ہے۔ (غ) [دیکھو نمبر: 1685]

3245- سردی اور گرمی میں سورج کے طلوع اور غروب کے انتہائی نقطوں کو دو مشرق اور دو مغرب کہا ہے یا سورج اور چاند کے دو جائے طلوع اور انہی کے دو جائے غروب مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مطلع فجر اور مطلع سورج دو مشرق ہیں اور مغرب شمس اور مغرب شفق دو مغرب ہیں۔ (ر) اور یا آج کل کی اصلاح کے مشرق قریب اور مشرق بعید مراد لیے جائیں اور دوسری طرف پرانی دنیا ایک مغرب اور نئی دنیا دوسرا مغرب سمجھ لیا جائے تو کل روئے زمین اس تقسیم میں آجاتی ہے۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾

ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے آگے نہیں گزر سکتے۔ (3246)

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾

ان دونوں میں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَـَٔاتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾

اور اسی کی کشتیاں ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اٹھی ہوئی ہیں۔ (3247)

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾

سب جو اس کے اوپر ہیں فنا ہونے والے ہیں۔

وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾

اور تیرے رب کی ذات باقی رہتی ہے (جو) جلال اور عزت والا ہے۔ (3248)

3246- دو سمندر:[دیکھو نمبر: 2386] بعض نے مراد یہاں بحر ارض و بحر سماء لیے ہیں اور بعض نے بحر احمر اور بحر روم۔ (ج) اور ظاہر کے لحاظ سے یہ دوسرے معنی بھی درست ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہی وہ قطعہ زمین ہے جو اقوام عالم کا اس وقت جولانگاہ بنا ہوا ہے اور ان دونوں سمندروں کو اب ملا بھی دیا گیا ہے اور سمندروں کا ملانا یہی ہے کہ ان دونوں میں جہازوں کا رستہ کھل جائے اور انہی دو میں جہازوں کی تگ و دو بھی سب سے زیادہ ہے جن کی طرف [آیت :24] اشارہ کرتی ہے۔

3247- ﴿الْمُنْشَـَٔاتُ﴾ نَشَآءٌ سے ہے اور یہاں مراد [مَرْفُوْعَةُ الشُّرُعِ] ہے یعنی جن کے بادبان بلند ہوں۔ (ل) اور ہوسکتا ہے کہ مراد صرف سمندر کے اوپر اٹھی ہوئی ہوں۔ اور پہاڑوں کی طرح اٹھی ہوئی کشتیاں وہی ہیں جو اس زمانہ میں نظر آتی ہیں اور انہی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں، نہ جیسا کہ ان کے مالک تصور کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہی خدا سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ آخر کار یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے آگے جھکیں گے۔

3248- ﴿فَانٍ﴾ فَنَا نقیض بقا ہے اور فَانٍ اس سے اسم فاعل ہے اور فِنًی اس پر بھی بولا جاتا ہے جو موت کے قریب ہو۔ اس لیے شَیْخٌ

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ اسی سے مانگتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ ہر آن وہ ایک شان میں ہے۔(3249)

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فَانٍ بہت بوڑھے آدمی کو کہا جاتا ہے اور گھر کا **فِنَاءٌ** اس کے سامنے کے صحن کو کہا جاتا ہے، اس لیے کہ گھر وہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔ (ل) اور چونکہ **بَقَا** کسی چیز کا اپنی پہلی حالت پر ثابت رہنا ہے [دیکھو نمبر: 1494] اس لیے **فَانٍ** سے مراد ہے کہ اپنی پہلی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ گویا ہر چیز پر تغیر آتا رہتا ہے۔

﴿**الْجَلٰلِ**﴾ **جَلَالَةٌ**۔ **عِظَمُ الْقَدْرِ** یعنی مرتبہ کی بڑائی ہے اور **جَلَالٌ** (بغیر ہائے کے) اس میں انتہا کو پہنچ جانا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے وصف سے مخصوص ہے اور اس کے غیر میں استعمال نہیں ہوا اور **جَلَلٌ** سے حقیر شے مراد لی جاتی ہے۔ [**كُلُّ مُصِيْبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ**] (غ)

سب مخلوق قانون فنا کے ماتحت ہے:

قریباً ایسے ہی الفاظ سورۂ القصص کی آخری آیت میں ہیں ﴿**كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ**﴾ [القصص: 88:28] ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے جس سے اس کا ارادہ کیا جائے۔'' جس پر بحث [نمبر: 2544] میں گذر چکی ہے۔ یہاں بھی اگر وہی معنی لیے جائیں تو سیاق کے مطابق ہیں۔ اوپر ذکر ظاہری نعمتوں کا ہے تو یہاں بتایا ہے کہ یہ چیزیں باقی رہنے والی نہیں، باقی رہنے والے صرف وہی اعمال ہیں جن میں رضائے الٰہی مقصود ہو۔ پس تم اس نعمت کا انکار کیوں کرتے ہو۔ اور دوسرے معنی وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔ یعنی ہر چیز ہر آن ایک تغیر کے ماتحت ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تغیر سے پاک ہے۔ گویا خالق اور مخلوق میں فرق یہ ہے کہ خالق کی ذات میں کوئی تغیر نہیں اور مخلوق کوئی بھی اور کسی وقت بھی تغیر سے پاک نہیں۔ پس تم مخلوق کی رضامت چاہو اور اتنی بڑی نعمت کو جو رضائے الٰہی ہے نہ چھوڑو۔

3249- **اللہ کے شان میں ہونے سے مراد:** ان کے سوال سے مراد ان کا محتاج ہونا اور اس احتیاج کا اکثر اظہار حالت سے ہی ہوتا ہے اور ﴿**كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ**﴾ کے متعلق ابن ماجہ میں ہے: [**مِنْ شَأْنِهِ أَنْ يَّغْفِرَ ذَنْبًا وَيُفَرِّجَ كَرْبًا وَيَرْفَعَ قَوْمًا وَيَخْفِضَ آخَرِينَ**] (سنن ابن ماجه، باب فِيمَا أَنْكَرَتِ الْجَهْمِيَّةُ، حديث: 207) (ر) اس کی شان سے یہ ہے کہ گناہ کو معاف کرے، مصیبت کو دور کرے اور کسی قوم کو بلند کرے اور کسی کو ذلیل کرے اور ایک روایت میں یہی لفظ ساتھ فرمائے ہیں [**وَيُجِيْبُ دَاعِيًا**] دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرے اور فی الحقیقت ہر ایک کی احتیاج کو پورا کرنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے اور یہی اس کی شان ہے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾

ہم تمہاری طرف جلد متوجہ ہوئے اے دونوں گروہو۔ (3250)

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ اگر تمہیں طاقت ہے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے، مگر غلبہ کے ساتھ۔ (3251)

3250- ﴿سَنَفْرُغُ﴾ نَفْرُغُ کے معنی ابن الاعرابی نے نَعْمِدُ کیے ہیں اور جریر کا شعر نقل کیا ہے جس میں فَرَغْتُ بمعنی عَمَدْتُ آیا ہے یعنی عمد یا قصد کیا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے [اَفْرُغْ اِلٰی اَضْيَافِكَ] جس میں معنی [اَعْمِدْ وَ اَقْصِدْ] ہیں۔ (ل) اور یہاں متوجہ ہونے سے مراد سزا دینے کے لیے متوجہ ہونا ہے اور معمولی معنی لے کر بھی مراد وہی ہوگی یعنی سخت سزا دینا۔ کیونکہ کسی چیز کے لیے فارغ ہونا اکثر تہدید کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ گویا اس کی خاطر اور سب کاموں کو چھوڑ دیا اور ابن عطیہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے عذاب دنیا کا وعدہ قرار دیتے ہیں۔ (ر)

﴿الثَّقَلٰنِ﴾ عرب ہر ایک نفیس قیمتی شے کو جو محفوظ کی جاتی ہو ثَقَلٌ کہتے ہیں اور اسی سے بڑے عزت والے سردار کو بھی ثَقَلٌ کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسان کو ثَقَلَانِ کہا ہے اس لیے کہ انہیں باقی سب جانداروں پر جو زمین میں ہیں یہ فضیلت دی ہے کہ عقل اور تمیز سے مخصوص ہیں۔ اور ابن الانباری کا قول ہے کہ اس لیے انہیں ثَقَلَانِ کہا ہے کہ وہ زمین پر ثَقَلٌ کی طرح ہیں یعنی بوجھ کی طرح۔ اور حدیث میں سوال قبر میں آتا ہے [يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِلَّا الثَّقَلَيْنِ] (سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب: فِي الْمَسْأَلَةِ فِي الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ، حدیث: 4755) یعنی انسانوں اور جنوں کے سوائے اسے سب سنتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے [وَإِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعِتْرَتِي] (مسند احمد، جلد23، صفحہ462، حدیث 11430) میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، کتاب اللہ اور اپنی عترت اور انہیں ثَقَلَانِ ان کے قدر اور شان کی عظمت کے لحاظ سے کہا ہے۔ (ل) اور حسن کا قول ہے کہ جن و انس کو ثَقَلَانِ ان کے گناہ کے بوجھ کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ (ر) اور یہاں مراد حق کی مخالفت کرنے والے ہیں جن کی سزا کا آگے ذکر بھی ہے۔ اور جِنّ سے مراد وہ غیر مرئی ہستیاں بھی ہوسکتی ہیں جو انسان کے اندر بدی کی تحریک کرتی ہیں۔ اور ایسے انسان بھی ہوسکتے ہیں جو ابھی موجود نہ ہونے اور آنکھوں سے مستور ہونے کی وجہ سے جِنّ کہلا سکتے ہیں۔

3251- ﴿تَنْفُذُوْا﴾ نَفَذَ کسی چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو پھاڑ کر اس کی ایک طرف سے دوسری طرف نکل جائے اور

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ تم دونوں پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑا جائے گا تو تم اپنے آپ کو بچا نہ سکو گے۔ (3252)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ سو جب آسمان پھٹ جائے گا اور سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ چمڑا۔ (3253)

اسی سے [نَفَاذَ فِي الْأَمْرِ] ہے۔ (غ)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچنے کی کوئی راہ نہیں بغیر غلبہ کے اس سے بچ نہیں سکتے اور غلبہ انہیں مل نہیں سکتا۔

3252- ﴿شُوَاظٌ﴾ وہ شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔ (غ) اور بعض کے نزدیک دھوئیں سے ملا ہوا شعلہ ہے۔ اور ضحاک کا قول ہے کہ وہ دھواں ہے جو شعلہ سے نکلتا ہے۔ (ر) ﴿نُحَاسٌ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2934] اور بخاریؒ نے پگھلا ہوا تانبا معنی لیے ہیں۔

شعلوں اور دھوئیں کی سزا:

یہ سزا ضحاک کے قول میں دنیا میں ہے اور ابن ابی شیبہ نے ان سے اسی آیت کی تفسیر میں یہ روایت کی ہے کہ مغرب کی طرف سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو اکٹھا کر دے گی۔ اور بحر محیط میں ہے کہ مراد اس سے جنوں اور انسانوں کا عاجز آجانا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ تمہاری حالت اس شخص کی ہوگی جس پر شعلے اور دھواں بھیجا جائے۔ پس اسے اس سے بچنے کی طاقت نہ ہو۔ (ر) اور ضحاک کی روایت اس جنگ عظیم پر خوب چسپاں ہوتی ہے جس کا مزہ ابھی یورپ چکھ چکا ہے۔ جس میں واقعی آگ کے شعلے اور گیس یا دھواں اس طرح برسائے گئے کہ لوگوں کی حالت دیوانوں کی طرح ہوگئی۔

3253- ﴿وَرْدَةً﴾ ﴿وَرْدٌ﴾ گلاب کا پھول ﴿وَارِدٌ﴾ سے ہے جو پانی کی طرف پہلے جاتا ہے اور گلاب کے پھول کو اس لیے ﴿وَرْدٌ﴾ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے نکلتا ہے اور سب درختوں کے شگوفوں کو ورد کہا جاتا ہے۔ اور آسمان کو ﴿وَرْدٌ﴾ کہا جاتا ہے جب وہ بہت سرخ ہو جائے اور یہ قیامت کی نشانی کے طور پر ہے۔ ﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (غ)

﴿كَالدِّهَانِ﴾ ﴿دُهْنٌ﴾ تیل کو کہتے ہیں اور ﴿دَهَنَ﴾ تیل لگایا اور اسی سے ﴿مُدَاهِنَةٌ﴾ اور ﴿اِدْهَانٌ﴾ ہیں جن کے معنی ایک دوسرے سے ملائمت اور نرمی کرنا ہیں۔ اور ﴿مُدَاهِنَةٌ﴾ یہ ہے کہ اس کے خلاف ظاہر کیا جائے جو دل میں ہے اور ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝﴾ [القمر: 9:68] میں معنی ہیں تو اپنے دین میں نرم ہو جائے تو وہ بھی نرم ہو جائیں یا خلاف ضمیر ظاہر کرے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾

سو آج کے دن نہ انسان سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور نہ جن سے۔ (3254)

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾

مجرم اپنے نشانوں سے پہچانے جائیں گے۔ پھر پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے۔ (3255)

﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ [الواقعة: 81:56] ''تو کیا تم اس کلام کو جھوٹا قرار دو گے۔'' میں معنی ہیں مُكَذِّبُوْنَ یعنی جھٹلانے والے اور دِهَانٌ سرخ چمڑے کو کہتے ہیں جو نہایت صاف ہو۔ اور ابو اسحاق کا قول ہے کہ مراد یہاں یہ ہے کہ آسمان مختلف رنگ بدلے گا۔ جیسے مختلف چمڑوں کے رنگ ہوتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ ہے ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾﴾ [المعارج: 8:70] ''جس دن آسمان تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا۔'' (ل) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد [دُرْدِيُّ الزَّيْتُ] یعنی تلچھٹ ہے۔ (غ)

یہ قیامت کا ذکر ہے اور آسمان کے انشقاق سے مراد اجرام سماوی کا انشقاق بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی اصل حقیقت پر کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا۔

3254- **قیامت میں نتائج اعمال کا ظہور:** دوسری جگہ ہے ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾﴾ [الحجر: 92:15] ''سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سے پوچھیں گے۔'' تو وہاں سوال سے مراد باز پرس ہے یعنی سزا دینا اور یہاں مطلب یہ ہے کہ یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ تم نے فلاں گناہ کیا یا نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ اگلی آیت میں آتا ہے مجرم اپنے نشانوں سے پہچانے جائیں گے بالفاظ دیگر گناہ خود بخود اپنے نتائج سے ظاہر ہوں گے، پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن نتائج کا ظہور ہوگا اور ہر چیز کا خود بخود اپنے نتیجہ سے پتہ لگ جائے گا، یہی اعضا وغیرہ کی شہادت ہے۔

3255- ﴿بِالنَّوَاصِيْ﴾ نَوَاصِيْ۔ نَاصِيَةٌ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 1474] دونوں اطراف کا نام لیا ہے اور مراد کل ہے اور ان کا پکڑا جانا بھی انہی نتائج کا ظہور ہے جن کا ذکر ﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ﴾ میں ہے۔ اور عذاب کے ذکر کے ساتھ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾﴾ کہہ کر بتایا کہ نعمتوں کو جھٹلانے کا نتیجہ ہی عذاب ہے۔ پہلے رکوع میں یہ لفظ اپنی نعمائے ظاہری کے ساتھ بڑھائے ہیں اور یوں نعمائے باطنی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دوسرے رکوع میں مجرموں کی سزا کے ذکر کے ساتھ یہ لفظ بڑھائے ہیں اور یوں ان کے جھٹلانے کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور تیسرے میں مومنوں کے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے یہی لفظ فرمائے ہیں

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یہ وہ دوزخ ہے جسے مجرم جھٹلاتے تھے۔

وقف لازم

یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ وہ اس کے اور کھولتے پانی کے درمیان پھریں گے۔

2 ع 20 12 فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا ہے اس کے لیے دو جنت ہیں۔ (3256)

اور یوں بتایا ہے کہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو کام میں لانے کا انجام خوشی ہے۔ اور جس طرح پر وہ راحت جو مومنوں کو اپنے قویٰ کے استعمال صحیح سے حاصل ہوتی ہے، اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ جیسا کہ اگلے رکوع میں دو جنتوں کے ذکر میں صاف بتا دیا۔ اسی طرح وہ سزا جو مجرموں کو ملتی ہے اس کا ایک رنگ یہاں بھی مل جاتا ہے۔ ہاں یہاں وہ آگ اور وہ گرفت سب کچھ ظاہر نظروں سے مخفی مگر دلوں کو محسوس ہوتی ہے، قیامت میں یہ سب کچھ ظاہری طور پر دیکھنے میں آجائے گا۔

3256- **اللہ کے خوف سے مراد:** خَوْفٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 59] اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ خطرہ مراد نہیں ہوتا جو رعب کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتا ہے، جیسے شیر سے خوف کا احساس۔ بلکہ اس سے مراد گناہوں سے رکنا اور طاعات کا اختیار کرنا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس شخص کو ڈرنے والا نہیں کہا جا سکتا جو گناہوں کو نہ چھوڑتا ہو۔ (غ) ﴿مَقَامَ﴾ مصدر میمی بمعنی قیام ہے تو ﴿خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ سے مراد یہ ہوئی کہ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے اور اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ میں نے اپنے رب کے سامنے جا کر کھڑا ہونا ہے۔ اور جس کو یہ فکر ہوگی وہی معاصی سے بچے گا اور طاعات میں قدم بڑھانے کی کوشش کرے گا۔

مومن کے لیے دو بہشتوں کا وعدہ:

ایسے شخص کے لیے دو بہشت ہیں۔ مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ایک جنت فعل طاعات کا اور ایک ترک معاصی کا۔ اور ایک یہ کہ ایک جنت روحانی اور ایک جسمانی۔ میرے نزدیک دو جنتوں سے مراد ایک اس دنیا کی جنت ہے اور ایک آخرت کی جنت۔ کیونکہ متقی کو اس دنیا میں بھی جنت ملتی ہے، جس طرح مخالفین حق کے لیے قرآن شریف میں جگہ جگہ دو عذابوں کا وعدہ ہے۔ یہاں متقی کے لیے دو انعاموں کا وعدہ ہے جو برنگ جنت ہیں۔ اور دوسری جگہ نفس مطمئنہ کو یعنی ایسے نفس کو جو اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق پیدا کر چکا ہے مخاطب کر کے فرمایا: ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝﴾ [الفجر: 89:29-30]

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۶﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾	دونوں (بہشت) شاخوں والے ہیں۔ (3257)
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾	ان دونوں میں دو چشمے بہتے ہیں۔
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾	ان دونوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

''سو میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔'' گویا اسے دنیا میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ اور پھر اس دنیا کی جنت سے مراد فتوحات ظاہری بھی ہو سکتی ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ حدیث میں جو دجلہ و فرات یا نیل کو انہار جنت میں سے قرار دیا تو وہ شاید اسی طرف اشارہ ہو۔ لیکن یہاں ﴿مَنْ خَافَ﴾ میں الفاظ میں عمومیت ہے اور اس لیے مراد اس دنیا کی روحانی جنت ہے اور ہر ایک شخص جو رضائے الٰہی کے رستوں پر قدم مارتا ہے اور ہر ایک قسم کی بدی سے بچتا ہے، یقیناً اس دنیا میں بھی ایک جنت پا لیتا ہے۔ اور یہ جنت بطور ایک نشان کے ہوتی ہے کہ اس کے لیے آخرت میں بھی جنت ہے۔ جس طرح اس دنیا کی سزا آخرت کی سزا کا پیش خیمہ ہے۔

3257- ﴿ذَوَاتَآ﴾ ذُوْ عام استعمال میں وہ ہے جس کے ذریعہ سے اسمائے اجناس اور انواع کے وصف کی طرف پہنچا جاتا ہے اور یہ ہمیشہ مضاف ہی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث میں ذَاتٌ کہا جاتا ہے اور تثنیہ میں ذَوَاتَا اور جمع میں ذَوَاتٌ۔ ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ [النجم: 6:53] ''حکمت والے نے۔'' ﴿ذَوِی الْقُرْبٰی﴾ [البقرة: 177:2] ''قریبیوں۔'' ﴿ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ [الکهف: 18:18] ''دائیں اور بائیں۔'' اور اسی سے لفظ ذَاتَ لیا گیا ہے جس سے مراد کسی شے کا عین لیا جاتا ہے، جوہر ہو یا عرض اور یہ کلام عرب سے نہیں۔ اور [ذَا هٰذَا] میں اشارہ ہے معقول کی طرف یا محسوس کی طرف اور اس کے مقابل میں اس کے لیے جو ظاہر طور پر دور ہو یا مرتبہ کے لحاظ سے بڑا ذٰلِكَ کہا جاتا ہے۔ (غ)

﴿اَفْنَانٍ﴾ فَنَنَ کی جمع ہے۔ اس شاخ کو کہتے ہیں جو تازہ پتوں والی ہو اور کسی چیز کی نوع کو بھی کہتے ہیں اور اس صورت میں جمع فُنُوْنٌ آتی ہے۔ اور ﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ﴾ سے مراد ہے شاخوں والے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے مختلف رنگوں

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾

ایسے بچھونوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے جن کے استر موٹے ریشم کے ہیں اور دونوں باغوں کے پھل قریب ہیں۔ (3258)

فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾

تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾

ان میں نگاہوں کو نیچی رکھنے والی ہوں گی جنہیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ جن نے۔ (3259)

والے۔ (غ) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں معنی کیے ہیں [ذَوَاتَا اَنْوَاعٌ مِّنَ الْاَشْجَارِ وَالثِّمَارِ] درختوں اور پھلوں سے مختلف نوعوں والے۔ (ر)

3258- ﴿بَطَآىِٕنُهَا﴾ بَطَآئِنُ۔ بِطَانَةٌ کی جمع ہے استر یا کسی چیز کا اندر خلاف اس کے ظاہر کے۔ [دیکھو نمبر: 505]

﴿اِسْتَبْرَقٍ﴾ کے معنی دیباج یا موٹا ریشم ہیں۔ مگر اسی فارسی یا سریانی سے معرب خیال کیا گیا ہے حالانکہ اس کی تصغیر عربی زبان میں اُبَیْرِقٌ موجود ہے۔ اور اس کا مادہ بَرْقٌ موجود ہے، جس سے بہت سے مشتقات آئے ہیں۔ اور تاج العروس میں ﴿اِسْتَبْرَقٍ﴾ کے معنی لکھے ہیں بجلی سے روشن ہو گیا یا چمک اٹھا اور ﴿بَطَآىِٕنُهَا﴾ کو ﴿اِسْتَبْرَقٍ﴾ کہہ کر یہ اشارہ کیا ہے کہ وہ اندر سے بھی چمک رہے ہوں گے اور ان تمام نعمتوں کے ذکر میں ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾﴾ کا رنگ ہے۔

3259- ﴿يَطْمِثْهُنَّ﴾ يَطْمِثُ۔ طَمْثٌ خون حیض ہے اور اس کے معنی چھونا ہیں خواہ کسی قسم کی چیز ہو۔ کہا جاتا ہے [مَا طَمَثَ ذٰلِكَ الْمَرْتَعَ قَبْلَنَا اَحَدٌ] یعنی اس چراگاہ کو ہم سے پہلے کسی نے نہیں چھوا (یا اس میں کوئی داخل نہیں ہوا)۔ اور ایسا ہی اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے [مَا طَمَثَ الْبَعِيْرَ حَبْلٌ] یعنی رسہ نے اسے نہیں چھوا اور یہاں معنی [لَمْ يَمْسَسْ] ہیں، یعنی نہیں چھوا۔ (ل)

﴿قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حوران بہشتی ہیں یعنی نعمائے جنت میں سے ایک نعمت اور دوسرا یہ کہ وہ اس دنیا کی عورتیں ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اس دوسری پیدائش میں انہیں جن یا انسان نے نہ چھوا ہوگا اور یہ دوسرا قول شعبی اور کلبی کا ہے۔ (ر) اور ام سلمہ کی حدیث میں ہے [نِسَاءُ الدُّنْيَا أَفْضَلُ مِنَ الْحُوْرِ الْعَيْنِ] (المعجم الكبير، باب: ذكر أزواج رسول الله ﷺ منهن، أم سلمة واسمها هند بنت أبي أمية ....) دنیا کی عورتیں حوروں سے بڑھ کر ہیں۔ (ر) مفسرین نے اس موقعہ پر یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ جنوں کی نفی طمث سے کیا مطلب ہے؟ کیا جن اس بات پر قادر ہیں کہ انسانوں کے ساتھ ان کے اس قسم کے تعلقات ہو سکیں۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ اہل یمن کی ایک قوم نے امام مالک رحمہ اللہ کو لکھا تھا کہ

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾	گویا کہ وہ یاقوت اور مونگا ہیں۔
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾	نیکی کا بدلہ سوائے نیکی کے کچھ نہیں۔ (3260)

یہاں ایک جن مرد ہے جو ایک انسان عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، تو امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں کوئی برائی تو نہیں۔ لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ ایک عورت حاملہ پائی جائے تو وہ کہہ دے کہ یہ جن کی طرف سے ہے اور اسلام میں فتنہ بڑھے۔ (ر) یہ روایت بھی عجیب ہے کہ جن اس زمانہ میں ایسی مرئی ہستیاں تھیں جیسے انسان کہ اہل یمن لکھتے ہیں کہ ایک جنّ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ بہرحال امام مالک رحمہ اللہ کا جواب بتاتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں کہ جنوں کے انسانوں سے اس قسم کے تعلقات ہو سکتے ہیں، ورنہ زنا کار عورتوں کا یہ عذر بنا بنایا تھا۔ اور یہاں یہ بحث اس غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ طمث کو خاص معنی میں لیا جاتا ہے۔ حالانکہ لغت میں اس کے عام معنی چھونا ہی ہیں۔ اور یہاں مراد صرف اسی قدر ہے کہ وہ نعمتیں ایسی محفوظ رکھی گئی ہیں کہ نہ انسان ان کے پاس پھٹکا ہے نہ جنّ۔

کیا جنّ جنت میں جائیں گے؟:

ایک اور سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ کیا جنوں کو ثواب ملے گا۔ امام ابو یوسف، امام محمد رحمہما اللہ وغیرھما کا قول ہے کہ جنوں کو طاعت پر ثواب ملے گا اور وہ جنت میں داخل ہوں گے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تین روایتیں ہیں۔ اول یہ کہ ان کے لیے کوئی ثواب نہیں سوائے اس کے کہ وہ آگ سے نجات پا جائیں گے اور پھر انہیں حکم ہوگا کہ دوسرے حیوانات کی طرح مٹی ہو جائیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہوں گے مگر دخول جنت سے بڑھ کر انہیں کوئی ثواب نہ ملے گا۔ تیسرا قول توقف کا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ جنوں کو عذاب اور آگ میں جانے کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مگر ان کے بہشت میں جانے کا کوئی ذکر نہیں، نہ ان نعماء کے حاصل کرنے کا ذکر ہے جو اہل جنت کے لیے ہیں۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہئے تھا، اس لیے کہ وہ ادنیٰ درجہ کی ہستیاں ہیں اور جنت کے اعلیٰ مقام کو حاصل نہیں کر سکتیں۔ وہ انسان کی صفات بہیمی سے تعلق رکھتی ہیں اور بہشت میں چونکہ صفات بہیمی نہ ہوں گی اس لیے جنات کا بھی وہاں کوئی کام نہیں اور دوزخ میں وہ اس لیے ہیں کہ صفات بہیمی کی وہاں اصلاح ہوگی۔ اور جب تک وہ اصلاح نہ ہو جائے ایک نہ ایک رنگ میں ان ہستیوں کا باقی رہنا بھی ضروری ہے جو ان صفات سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن بہشت میں وہی جائے گا جس کی صفات بہیمی کی اصلاح ہو چکی ہے۔

3260- یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ یہ نعمتیں جن کا اوپر ذکر ہے جن میں باغ اور پھل اور ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ ہیں یہ سب کچھ ان نیکیوں کا

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ اور ان سے ادھر دو اور باغ ہیں۔ (3261)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ دونوں بہت سرسبز ہیں۔ (3262)

اجر ہے جو کسی انسان نے کی ہیں۔ پس ان نعمتوں میں ضروری ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس آیت نے عمل کے لیے ایک نہایت خوبصورت راہ بتائی ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ احسان کرے۔ بہت لوگ ہیں جو یہ تو چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے ساتھ نیکی کریں مگر خود دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور **یَاقُوْتٌ** جواہر میں سے ہے کہ جس کی جمع **یَوَاقِیْتُ** ہے۔

3261- **مقربین اور اصحاب الیمین کے لیے جنت:** یہ دو جنت ہر رنگ میں پہلے دو جنتوں کی طرح ہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک سابقین مقربین کے لیے ہیں اور دوسرے معمولی مومنین کے لیے۔ اور اگلی سورت میں ان دونوں گروہوں کا بالتفصیل ذکر ہے یعنی سابقین یا مقربین کا اور اصحاب الیمین کا۔ اور ﴿مِنْ دُوْنِهِمَا﴾ میں اشارہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سے کمتر ہیں۔ اس لیے پہلے سابقین کے لیے ہیں اور یہ اصحاب الیمین کے لیے۔ اور ابن جریر میں اس کے مطابق ایک مرفوع روایت بھی ہے اور بعض نے پچھلے دو کو افضل کہا ہے۔ مگر پہلا قول قابل ترجیح ہے [دیکھو نمبر: 3280] اور اگلی سورت میں جہاں دونوں گروہوں کا تفصیل سے ذکر کیا، سابقین کے ذکر کو ہی مقدم کیا ہے۔ اس لیے یہاں بھی وہی مقدم ہونا چاہئے اور یہ بھی دو ہی جنت ہیں، یعنی ایک اس دنیا کا اور ایک آخرت کا۔ اور ان جنتوں میں چار چشموں یا دریاؤں کا ذکر ہے اور اس میں ایک طرف اشارہ **فتوحاتِ ملکی** کی طرف بھی ہے۔ چنانچہ حدیث مسلم میں [مَا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ] کے باب میں ہے [عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ وَالْفُرَاتُ وَالنِّيلُ كُلٌّ مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ] (صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب مَا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ: 7340) یعنی سیحون اور جیحون اور فرات اور دجلہ (نیل کا لفظ یہاں دجلہ کے لیے ہی معلوم ہوتا ہے) جنت کی نہروں میں سے ہیں۔ تو یہ بھی چار ہی دریا ہیں۔ اور یوں ان چاروں دریاؤں کے ذکر میں جو ان آیات میں مذکور ہیں ان چار کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں نے پہلے اس علاقہ کو فتح کیا جس میں دجلہ و فرات ہیں اور بعد میں اس کو جس میں سیحون اور جیحون ہیں۔

3262- ﴿مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾﴾ **دُهْمَةٌ** رات کی سیاہی کو کہتے ہیں اور اس سے گھوڑے کی سیاہی بھی مراد لی جاتی ہے۔ اور ایسی سبزی بھی جس کا رنگ کمال سرسبزی کو پہنچا ہوا ہو۔ (غ)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۲۶﴾	ان دونوں میں دو چشمے جوش مار رہے ہیں۔ (3263)
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۷﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۲۸﴾	ان دونوں میں پھل ہے اور کھجور اور انار۔ (3264)
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۹﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾	ان میں اچھی خوب صورت ہوں گی۔ (3265)
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾	حوریں جو خیموں ٹھہرائی ہوئی ہیں۔ (3266)

3263- ﴿نَضَّاخَتٰنِ﴾ نَضْخٌ کے معنی پانی کے جوش مارنے کی شدت اور اس کا چشمہ سے پھوٹ کر نکلنا ہیں اور [عَیْنٌ نَضَّاخَةٌ] وہ چشمہ ہے جو پانی کے ساتھ جوش مار رہا ہو۔ (ل) گویا یہ ابتدا ہے اور پہلی حالت میں وہ چشمے بہہ رہے ہیں۔ اسی طرح یہاں صرف باغوں کی سرسبزی کی طرف توجہ دلائی ہے اور پہلی صورت میں انہیں بہت شاخوں والے قرار دیا ہے۔

3264- ﴿رُمَّانٌ﴾ انار ہے اور ﴿فَاكِهَةٌ﴾ کے بعد ﴿وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ﴾ کے ذکر میں عطف خاص علی العام ہے اور پہلے جنتوں میں ہر پھل کے دو نوع قرار دیئے ہیں اور یہاں اس کا ذکر نہیں۔

3265- ﴿خَیْرٰتٌ﴾ خَیْرَةٌ کی جمع ہے [وَهِیَ الْفَاضِلَةِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ] یعنی ہر قسم کی فضیلت والی چیز کو خَیْرَةٌ کہا جاتا ہے۔ (ل) اور اچھی عورت کو بھی [اِمْرَاَةٌ خَیْرَةٌ] کہا جاتا ہے۔ اور یہاں خَیْرٰتٌ سے مراد خَیِّرَاتٌ ہیں اور خَیِّرٌ اسے کہتے ہیں جو فاضل ہو اور خیر سے مختص ہو۔ (غ) اور قرآن کریم میں ہے ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ﴾ جہاں خیرات سے مراد خوبیاں اور بھلائیاں ہی ہیں۔ ﴿حِسَانٌ﴾ حَسَنٌ اور حَسَنَةٌ کی جمع حِسَانٌ آتی ہے اور حَسْنَاءُ کی بھی۔ اور [اِمْرَاَةٌ حَسْنَاءُ] خوبصورت عورت کو کہا جاتا ہے۔ (ل)

3266- ﴿الْخِیَامِ﴾ خَیْمَةٌ دیہاتیوں کا گھر ہے جسے وہ درختوں کی ٹہنیوں سے بناتے ہیں۔ اور عرب کے نزدیک وہ بَیْتٌ اور مَنْزِلٌ کی طرح ہے اور بعض کا قول ہے کہ اگر درختوں سے نہ بنا ہو تو اسے خیمہ نہیں کہا جائے گا۔ اور حدیث میں ہے [اَلشَّهِیْدُ فِیْ خَیْمَةِ اللّٰهِ] اور یہ استعارہ ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ظل کے لیے کیونکہ دوسری حدیث میں ہے [اَلشَّهِیْدُ فِیْ ظِلِّ اللّٰهِ]

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾	انہیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ جن نے۔
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾	سبز قالینوں اور خوبصورت فرشوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔ (3267)
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾	تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔
تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾ ع	تیرے رب کا نام بابرکت ہے، جو جلال اور عزت والا ہے۔

ع 3/33/13

(ل) اور یہاں جن خیموں کا ذکر ہے وہ بھی استعارہ کا رنگ ہی ہو سکتا ہے۔ اور یا شاید مطلب یہ ہو کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئیں۔

3267- ﴿رَفْرَفٍ﴾ [رَفِيْفُ الشَّجَرِ] درخت کی شاخوں کا انتشار ہے اور [رَفِّ الطَّيْرِ] پرند نے اپنے بازو پھیلا لیے اور ﴿رَفْرَفٍ﴾ پھیلے ہوئے پتے ہیں۔ اور یہاں مراد ایک قسم کا کپڑا ہے جو مرغزار سے مشابہ ہوتا ہے۔ (غ) اور ﴿رَفْرَفٍ﴾ ایک حدیث میں خیمہ کی چھت کے معنی میں اور آنحضرت ﷺ کی وفات کی حدیث میں خیمہ کے پردہ کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ جمع ہے جس کا واحد رَفْرَفَةٌ ہے اور بعض نے یہاں ﴿رَفْرَفٍ﴾ سے مراد [رِيَاضُ الْجَنَّةِ] یعنی باغ کے قطعات لیے ہیں اور بعض نے فرش اور بچھانے کی چیزیں۔ (ل)

﴿عَبْقَرِيٍّ﴾ عَبْقَرُ ایک موضع کا نام ہے جس کے متعلق اہل عرب کا خیال تھا کہ وہ جنوں کی سرزمین میں ہے۔ پھر اس کی طرف ہر چیز کو نسبت کیا جاتا ہے۔ اس کی دانائی کی وجہ سے یا اس کے بنانے کی کمال خوبی اور اس کی قوت کی وجہ سے۔ (ل) اور حدیث میں (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق) ہے [فَلَمْ اَرَ عَبْقَرِيًّا يَفْرِيْ فَرِيْهِ] اور [عَبْقَرِيُّ الْقَوْمَ] قوم کے سردار اور ان کے بڑے کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ عرب عَبْقَرُ کو جنوں کا مکان سمجھتے تھے اس لیے جس چیز کو دیکھتے تھے کہ دوسروں پر فوقیت لے گئی ہے اور نادر ہے جس کا کرنا مشکل ہے یا اپنے نفس میں عظمت رکھتی ہے اسے عَبْقَرِيٌّ کہہ دیتے تھے۔ اور حدیث میں عَبْقَرِيٌّ بمعنی دیباج یا ایسے فرش کے آیا ہے جو نشانوں والا ہو۔ (ن) اور وہ ایک قسم کا فرش ہے اور یہاں جنت کے فرشوں کے لیے بطور مثال بیان کیا گیا ہے۔ (غ) اس سے معلوم ہوا کہ عظمت یا ندرت کے لحاظ سے جنّ کی طرف نسبت دینے کا عرب میں عام محاورہ تھا۔

اٰیَاتُهَا 96 (56) سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ (46) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ — جب ہو جانے والی (بات) ہو جائے گی۔

وقف لازم لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ — اس کے ہو جانے میں کوئی جھوٹ نہیں۔ (3268)

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝٣ — (وہ کسی کو) نیچا کرنے والی (کسی کو) بلند کرنے والی (ہے)۔

سورۃ الواقعہ

نام:

اس سورت کا نام اَلْوَاقِعَةِ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 96 آیتیں ہیں۔ اس کا نام اَلْوَاقِعَةِ پہلی ہی آیت میں مذکور ہے اور یہ وقوع میں آنے والی چیز جزا و سزا کی گھڑی ہے۔ اس دنیا کی جزا و سزا قیامت کی جزا و سزا دونوں اس کے اندر آ جاتی ہیں اور اس میں انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر ہے۔

① گروہ اول: جو مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔

② گروہ دوم: عامہ مومنین۔

③ گروہ سوم: مکذبین اور اعدائے حق۔

یہ سورت مکی ہے، اسی زمانہ کی ہے جس زمانہ کی اس سے پہلی سورت اور اس میں اسی کے مضمون کو جاری رکھا ہے۔ وہاں بھی دراصل تین گروہوں کا ہی ذکر تھا۔ یہاں واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔

3268- ﴿كَاذِبَةٌ﴾ اس موقعہ پر مصدر ہے جیسے عَافِيَةٌ۔ عَاقِبَةٌ (ج) یا كِذْبٌ یہاں نفس فعل کی طرف منسوب ہے جیسے [فِعْلَةٌ صَادِقَةٌ۔ فِعْلَةٌ كَاذِبَةٌ] اور ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ﴾ [العلق: 16:96] ''جھوٹی پیشانی۔'' میں مبالغہ ہے جیسے كَذَّابٌ میں۔ (غ) یا محذوف۔ موصوف نفس کی صفت اور اسم فاعل ہے۔ (ر)

﴿اَلْوَاقِعَةُ﴾ سے مراد قیامت لی گئی ہے لیکن اس کا اطلاق عام بھی ہے اور سختی اور ناپسندیدگی کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 2242] پس اس میں اشارہ قیامت کی طرف بھی ہے اور اس سزا کی طرف بھی جس کا مخالفین کو وعدہ دیا جاتا تھا۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾	جب زمین سخت حرکت سے ہلے گی۔ (3269)
وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ﴿۵﴾	اور پہاڑ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ (3270)
فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾	پس وہ اڑتا ہوا غبار ہو جائیں گے۔
وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ؕ﴿۷﴾	اور تم تین قسم ہو گے۔ (3271)
فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ﴿۸﴾	سو برکت والے، برکت والوں کی کیا (اچھی) حالت ہے۔ (3272)
وَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ؕ﴿۹﴾	اور بدبختی والے، بدبختی والوں کی کیا (بری) حالت ہے۔ (3273)
وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾	اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔
اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ﴿۱۱﴾	وہی مقرب ہیں۔

3269- ﴿رُجَّتِ﴾ رَجَّ کے معنی ہیں کسی چیز کو ہلانا اور اسے اضطراب میں کر دینا۔ اور ﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾﴾ کے وہی معنی ہیں جو ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ﴿۱﴾﴾[الزلزال: 1:99] ''جب زمین اپنے بھونچال سے ہلائی جائے گی۔'' کے معنی ہیں۔ (غ)

3270- ﴿بُسَّتِ﴾ بَسّ کے معنی ہیں ایک چیز کو ریزہ ریزہ کر دینا یا پیس ڈالنا اور بعض کے نزدیک اس کے معنی تیز چلانا بھی ہیں۔ (غ)

3271- ﴿اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً﴾ زَوْج کا استعمال وہاں بھی ہوتا ہے جہاں ایک چیز کا دوسری کے ساتھ ذکر کیا جائے، خواہ بلحاظ مماثلت اور خواہ بلحاظ مقابلہ ان تینوں گروہوں کو جن میں سے دو جنتی ہیں اور ایک اہل نار اس لحاظ سے اَزْوَاج کہا ہے کہ ایک ہی اصول پر عمل پیرا ہونے یا ان کو چھوڑنے سے وہ تین قسمیں بنتی ہیں۔

3272- ﴿الْمَيْمَنَةِ﴾ اور یُمْن کے ایک ہی معنی ہیں یعنی برکت۔ اور ﴿اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ﴾ وہ ہیں جو اپنے نفسوں پر برکت کا موجب ہوتے ہیں۔ (ل)

3273- ﴿الْمَشْئَمَةِ﴾ اور شُؤْم کے ایک ہی معنی ہیں اور یہ ضد یُمْن ہے یعنی نحوست۔ (ل)

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۱۲﴾ نعمتوں والے باغوں میں۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ ایک بڑی جماعت پہلوں میں سے۔

وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ اور تھوڑے پچھلوں میں سے۔ (3274)

3274- ﴿ثُلَّةٌ﴾ ثَلَّةٌ بھیڑ بکری کی جماعت پر بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک بڑی جماعت سے مخصوص ہے۔ اور ﴿ثُلَّةٌ﴾ انسانوں کی جماعت پر۔ (ل)

سابقین میں جو مقربان بارگان الٰہی ہیں فرمایا کہ **کثیر حصہ پہلوں میں سے** ہوگا اور تھوڑے پچھلوں میں سے۔ یہ **اولین کون ہیں؟** قرآن کریم نے خود دوسری جگہ بتادیا ﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ﴾ [التوبة: 100:9] ''اور پہلے سبقت لے جانے والے مہاجرین اور انصار میں سے۔'' اور اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ [نمبر: 1341] میں دکھایا گیا ہے کہ جس قدر قربانیاں اس وقت لوگوں نے کیں پچھلے زمانہ میں اس قدر قربانیاں نہیں کیں۔ ورنہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دروازۂ تکمیل بند کردیا ہے یا تنگ کردیا ہے اور بہت تھوڑے بلحاظ نسبت ہیں یعنی جو لوگ پہلے پہلے اسلام لائے انہیں چونکہ بڑے بڑے دکھ اللہ تعالیٰ کے رستے میں اٹھانے پڑے اس لیے ان کا بڑا حصہ مقربین بارگاہ الٰہی میں داخل ہوا۔ اور پچھلے لوگوں میں سے کثیر حصہ کو چونکہ ایسا مقابلہ پیش نہیں آیا اس لیے ان میں سے تھوڑے سابقیت کے مرتبہ کو حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ آیت جو **اولین میں سے کثیر حصہ کو مقربین بارگاہِ الٰہی ٹھہراتی ہے** نہ صرف **عیسائیوں پر ہی اتمام حجت کرتی ہے** جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ﴿مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ [آل عمران: 45:3] ''مقربوں میں سے ہوگا۔'' قرآن میں پاکر سمجھتے ہیں کہ ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا کے پاس پہنچے ہیں۔ یہ آیت امت محمدیہ کے اولین گروہ یعنی [اَوَّلِيْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ] سے کثیر حصہ کو مقربین میں داخل کرکے صاف بتاتی ہے کہ بلحاظ درجات یہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے نہیں رہے اور گروہ انبیاء میں ہی داخل ہیں۔ بلکہ **اہل تشیع پر بھی یہ حجت قاطع ہے** جو [اَوَّلِيْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ] کے کثیر گروہ کو نعوذ باللہ منافق قرار دیتے ہیں اور مومنین کی کثرت کو مہدی غائب کے ظہور سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم نہایت ہی کھلے الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اولین میں سے مقربین کا حصہ کثیر ہے اور آخرین سے قلیل۔ اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے آج ایک نئی نبوت قائم کرنے کی کوشش میں یہاں تک صحابہ کی شان میں گستاخی کی ہے کہ یہ لکھ دیا ہے کہ انہوں نے کامل فرمانبرداری رسول اللہ ﷺ کی نہیں کی، اسی لیے ان میں سے کوئی نبی نہ بنا، ان پر بھی یہ آیت اتمام حجت کرتی ہے۔ اور صحابہ کے کثیر حصہ کو مقربین بارگاہ الٰہی میں داخل کرکے یہ بتاتی ہے کہ انہوں نے جس حد تک آنحضرت ﷺ کی فرمانبرداری کی اس حد تک پچھلوں کو میسر نہیں آسکتا۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾	جڑاؤ تختوں پر۔ (3275)
مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾	ان پر تکیے لگائے ہوئے آمنے سامنے (ہوں گے)۔ (3276)
يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ﴿۱۷﴾	ان پر ہمیشہ ایک حالت میں رہنے والے لڑکے پھر رہے ہوں گے۔ (3277)
بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ﴿۱۸﴾	آب خورے اور لوٹے اور خالص پینے کا پیالہ لیے ہوئے۔
لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾	اس سے انہیں دردِ سر نہ ہوگا اور نہ وہ متوالے ہوں گے۔
وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾	اور میوہ جیسا وہ پسند کریں۔
وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ؕ﴿۲۱﴾	اور پرند کا گوشت جس کی انہیں خواہش ہو۔
وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۙ﴿۲۲﴾	اور خوبصورت حوریں۔
كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ﴿۲۳﴾	محفوظ رکھے ہوئے موتیوں کی طرح۔

3275- ﴿مَّوْضُوْنَةٍ﴾ وَضْنٌ زرہ کا بننا ہے اور ہر ایک مضبوط بننے پر استعمال ہوا ہے۔ (غ) اور وَضْنٌ کے اصل معنی ایک چیز کے بعض کا بعض پر دہراتے چلے جانا ہے۔ جیسے اینٹوں یا پتھروں کا اور سریر یا اور اسی قسم کی چیزوں کے جواہرات یا کپڑوں سے بننے پر بولا جاتا ہے۔ (ل) اور اس کے معنی ﴿مَصْفُوْفَةٌ﴾ بھی کیے گئے ہیں۔ (ج) یعنی قطاروں میں بچھائے ہوئے۔

3276- ﴿مُّخَلَّدُوْنَ﴾ اپنی حالت پر باقی رہنے والے ان میں استحالہ نہیں ہوگا (یعنی حالت تبدیل نہیں ہوگی)۔ یا زیوروں سے آراستہ کیونکہ خَلَدَةٌ ایک قسم کی بالی ہے۔ (غ)

3277- ﴿اَبَارِيْقَ﴾ اِبْرِيْقٌ کی جمع ہے کوزہ یا کوزہ کی مثل۔ اور ﴿اَكْوَابٍ﴾ اور ﴿اَبَارِيْقَ﴾ میں فرق یہ کیا گیا ہے کہ ﴿اَكْوَابٍ﴾ میں دستے اور ٹوٹی نہیں ہوتی اور ﴿اَبَارِيْقَ﴾ میں ہوتی ہے۔ (ج)

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ اس کا بدلہ، جو وہ عمل کرتے تھے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔

اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ مگر ایک ہی بات سلامتی سلامتی۔

وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ اور برکت والے، برکت والوں کی کیا (اچھی) حالت ہے۔

فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ بیریوں میں (ہیں) جن کے کانٹے نہیں۔[3278]

وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ اور کیلے تہہ بتہ (پھل والے)۔

وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ اور وسیع سایہ۔

وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ اور بلندی سے گرتا ہوا پانی۔[3279]

وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ اور بہت پھل۔

لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ نہ ختم ہو اور نہ (اس سے) روکے۔

وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اور بلند فرش۔

3278- ﴿مَّخْضُوْدٍ﴾ خَضْدٌ گیلی چیز کا یا خشک کا توڑنا ہے بشرطیکہ الگ الگ ٹکڑے نہ ہو جائیں اور درخت کے کانٹے توڑنے یا دور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور ایسے درخت کو ﴿مَّخْضُوْدٍ﴾ کہا جاتا ہے۔ (ل) اور یہ معنی ایک مرفوع حدیث میں بھی ہیں مگر مجاہد اور ضحاک سے اس کے معنی مروی ہیں جو پھل کے بوجھ سے شاخیں ٹوٹی پڑتی ہوں یا دہری ہو گئی ہوں۔ (ج) اور پہلے معنی ہی قابل ترجیح ہیں، اس لیے کہ ظاہر یہ کرنا ہے کہ اس دنیا کی بیریاں نہیں جن میں کانٹے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جنت میں کوئی ایذا دینے والی چیز نہیں اور وہاں کی بیریاں بھی کچھ اور حقیقت رکھتی ہیں۔

3279- ﴿طَلْحٍ﴾ کیلے کے درخت کو کہتے ہیں۔

اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾	ہم نے انہیں ایک نئی پیدائش میں اٹھا کھڑا کیا ہے۔
فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾	پس انہیں نوجوان بنایا ہے۔
عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾	محبت والیاں ہم عمر۔ (3280)

﴿مَّسْكُوْبٍ﴾ [سَكَبَ الْمَآءُ] کے معنی ہیں پانی بہایا۔ اور ﴿مَّآءٍ مَّسْكُوْبٍ﴾ بہایا ہوا یا گرایا ہوا پانی۔

3280- ﴿عُرُبًا﴾ عُرُبٌ۔ عَرُوْبَةٌ کی جمع ہے گویا وہ اپنے حال کو اپنی عفت سے اور خاوند کی محبت سے کھول کر بیان کر دینے والی ہے کیونکہ اَعْرَابٌ کے معنی بیان کرنا ہیں۔ (غ)

جنت میں اس دنیا کی عورتیں:

یہ عورتیں کون ہیں؟ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ ایک بڑھیا نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کریں کہ میں جنت میں جاؤں۔ آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی۔ وہ روتی ہوئی لوٹ گئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ مطلب یہ ہے کہ بڑھیا ہونے کی حالت میں کوئی عورت جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾﴾ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پہلے مقربین کے لیے کچھ نعماء کا ذکر ہے اور ان میں ﴿حُوْرٌ عِيْنٌ﴾ کا ذکر ہے اس کے مقابل پر یہاں ﴿اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ کے لیے ﴿عُرُبًا اَتْرَابًا﴾ کا ذکر ہے۔ اور یہ ترتیب ضروری ٹھہراتی ہے کہ یا تو دونوں جگہ مراد اس دنیا کی عورتیں لی جائیں تو اس صورت میں ﴿حُوْرٌ عِيْنٌ﴾ بھی انہی مقربین بارگاہِ الٰہی کی صفت ہوگی جو عورتوں میں سے قرب الٰہی کا بلند مرتبہ حاصل کرتی ہیں۔ اور یا ﴿اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾﴾ میں بھی ﴿حُوْرٌ عِيْنٌ﴾ کا ہی ذکر ہے گو لفظ دوسرے ہوں۔ اور میرے نزدیک ترجیح اسی دوسری بات کو ہی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اس قسم کا ذکر آیا ہے وہ نعمائے جنت میں سے ایک نعمت ہے جو مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے اور اعمال حسنہ کے نیک نتائج کو جس طرح ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے جو کھانے پینے سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کے لیے بقا کا موجب ہیں، اسی طرح ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے جو حسن منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور راحت اور لذت اور سرور کا موجب ہوتے ہیں جس طرح اس دنیا کی زندگی میں ایک وہ چیزیں ہیں جو انسان کی بقا کا موجب ہیں اور دوسری وہ جو اس کی راحت اور سرور کا موجب ہیں۔ اسی طرح نعمائے بہشتی میں دونوں چیزوں کا ذکر، اور غرض صرف یہ بتانا ہے کہ بہشت میں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں بھی ملیں گی جو انسان کی روح کے بقا کا موجب ہیں اور وہ بھی جو اس کی روح کے لیے لذت اور سرور کا موجب ہیں۔ پس ایک طرف اگر پھلوں اور گوشت کا اور پانیوں اور دودھ کا اور ایسی چیزوں کا ذکر ہے تو دوسری طرف مناظر حسن کا ذکر ہے۔ کیونکہ حسن انسان کی طبیعت میں سرور اور راحت پیدا کرنے میں سب سے بڑا سامان ہے۔ پھر اس حسن کا رنگ کہیں تو زیب و زینت کے سامانوں میں نظر آتا ہے جیسے تخت اور فرش یا مناظر قدرت کے رنگ میں جیسے چشمے

ع 1 38 14 لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ — برکت والوں کے لیے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ — ایک بڑی جماعت پہلوں میں سے۔

وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ — اور ایک بڑی جماعت پچھلوں میں سے۔

وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ — اور بائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والوں کی کیا (بری) حالت ہے۔

فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ — لُو میں، اور اُبلتے ہوئے پانی میں۔

اور درخت وغیرہ۔ لیکن ان دونوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی شکل میں حسن کو انسان کے لیے مرغوب خاطر کیا ہے۔ اس لیے منظر حسن و جمال کو کمال کو پہنچانے کے لیے اس رنگ کا بھی ذکر فرمایا ہے اور اسی میں حور وغلمان کا یا ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ [الصافات: 48:37] ''نیچی نگاہوں والی۔'' کا ذکر ہے، لیکن بہشت کی سب سے بڑی نعمت دیدار الٰہی کو قرار دیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ اصل غرض کیا ہے۔

مقربین اور اصحاب الیمین کی جنت میں فرق کا رنگ:

مقربین اور اصحاب الیمین کے لیے جن نعمتوں کا ذکر ہے ان میں ایک باریک فرق بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً جن نعماء کا ذکر مقربین کے لیے ہے عموماً اس رنگ کی ہیں جو تہذیب اور تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مرغوب خاطر ہوتی تھیں۔ مثلاً تخت اور لباس ہائے فاخرہ اور مجالس جن میں ہر قسم کا سامان سرور ہے اور جن نعماء کا ذکر اصحاب الیمین کے لیے ہے وہ ایسی ہیں جو عموماً ابتدائی مراحل پر انسان کی خوشی کا موجب ہوتی ہیں اور اس لیے اہل بادیہ یا دیہات کے رہنے والوں کے لیے ان میں لطف کا سامان ہوتا ہے جیسے بیریاں اور کیلے اور گرتا ہوا پانی۔ اور یہاں بیری اور کیلے کے ذکر میں بھی ایک پُرحکمت بات ہے۔ بیری ایسا درخت ہے جو خشک ترین مقامات میں ہو جاتا ہے اور کیلا کثرت پانی کو چاہتا ہے۔ اور اصل غرض یہ معلوم ہوتی ہے یہ سب ہی قسم کے پھلوں والے درخت ہیں۔ اور سورۂ الرحمٰن کے آخری رکوع میں بھی اسی قسم کا فرق دونوں قسموں کے باغوں میں رکھا ہے۔ مثلاً پچھلے باغوں کی سرسبزی کی طرف زیادہ توجہ دلائی ہے اور پہلوں کی کثرت اشجار اور شاخوں کی طرف۔ پچھلے باغوں میں چشمے جوش مار رہے ہیں جو نظارہ جنگلوں اور پہاڑوں کا ہے اور پہلوں میں وہ بہہ رہے ہیں۔ پچھلے باغوں میں جو حور ہیں وہ خیموں میں ہیں اور پہلوں میں خیموں کا ذکر نہیں۔ اور یوں مقربین کی ترقی روحانی کی وجہ سے ان کے لیے ترقی یافتہ قوموں کی راحت کے سامان کا ذکر ہے اور اصحاب الیمین کی ابتدائی حالت کی وجہ سے ان کے لیے انہی راحت کے سامانوں کا

وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ ٤٣	اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں۔ (3281)
لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ ٤٤	نہ ٹھنڈا اور نہ عزت والا۔
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ ٤٥	وہ اس سے پہلے آسودہ حال تھے۔
وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝ ٤٦	اور بڑے گناہ پر اصرار کرتے تھے۔
وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ ٤٧	اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے؟
اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ ٤٨	اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا بھی۔
قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ ٤٩	کہہ، پہلے اور پچھلے (سب)۔
لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ ٥٠	یقیناً ایک مقرر دن کے مقرر وقت پر اکٹھے کیے جائیں گے۔
ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۝ ٥١	پھر تم اے گمراہو! جھٹلانے والو!
لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝ ٥٢	ضرور تھوہر کے درخت سے کھاؤ گے۔
فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ ٥٣	پھر (اپنے) پیٹوں کو اس سے بھرو گے۔

ذکر ہے جن سے ترقی کے ابتدائی مراحل کی قومیں زیادہ مانوس ہوتی ہیں۔

3281- ﴿يَحْمُوْمٍ﴾ اسی مادہ سے ہے جس سے حَمِيْمٌ ہے دھواں جو سخت سیاہ ہو فرط حرارت کی وجہ سے یہ نام ہے۔ (غ) اور اس ظِلّ کو اگلی آیت میں ﴿لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ ٤٤﴾ کہا ہے کیونکہ سایہ میں بیٹھنے سے ٹھنڈک بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ عزت کا مقام بھی ہے۔ مگر اس سایہ میں ان دونوں باتوں کی نفی کی ہے۔ اور بعض نے كَرِيْمٍ سے مراد نَافِعٌ لیا ہے کیونکہ یہی اس کا کرم ہے۔

فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ پھر اس کے اوپر ابلتا ہوا پانی پیو گے۔

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ پھر پیو گے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾ یہ جزا کے دن ان کی مہمانی ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ ہم نے تم کو پیدا کیا پھر کیوں تم (دوسری پیدائش کو) سچ نہیں مانتے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ تو کیا تم نے دیکھا جو تم نطفہ ڈالتے ہو؟

ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ ہم نے تمہارے درمیان موت مقرر کر دی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں۔

عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں اور تمہیں اس صورت میں پیدا کریں جو تم نہیں جانتے۔ (3282)

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اور تم پہلی پیدائش کو جانتے ہو تو پھر نصیحت کیوں نہیں پکڑتے۔

3282- **بعث بعد الموت میں یہ جنم نہیں:** یہاں بعث بعد الموت پر ہی بحث ہے، اسی سے کفار انکار کرتے تھے۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے زور دیا۔ پس ﴿وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں بھی بعث بعد الموت کا ذکر ہے۔ اور یہاں صاف فرمایا کہ بعث میں تمہاری صورتیں ایسی ہوں گی جنہیں تم نہیں جانتے، یعنی یہ صورتیں نہ ہوں گی۔ پس یہ جسم بھی نہ ہوں گے۔ رہا یہ کہ پھر ایک دوسرے کو کس طرح پہچانیں گے؟ تو اگر اس دنیا میں بھی ایک انسان اپنی آواز تک سے پہچانا جا سکتا ہے تو وہاں جہاں سب حالات شکل و صورت میں عیاں اور آشکارا ہو جائیں گے، ایک دوسرے کو پہچاننا کون سا مشکل کام ہے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾

کیا تم نے دیکھا جو تم بوتے ہو؟

ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ الزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾

کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿٦٥﴾

اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں۔ تو تم تعجب کرنے لگے۔

إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ﴿٦٦﴾

(کہ) ہم پر چٹی پڑ گئی۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٦٧﴾

بلکہ ہم محروم ہو گئے۔

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِى تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾

کیا تم نے وہ پانی دیکھا جو تم پیتے ہو؟

ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾

کیا تم اسے بادل سے اتارتے ہو یا ہم اتارنے والے ہیں؟[3283]

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَٰهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾

اگر ہم چاہتے تو اسے کھاری بنا دیتے۔ تو کیوں تم شکر نہیں کرتے؟

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِى تُورُونَ ﴿٧١﴾

کیا تم نے آگ کو دیکھا جو تم روشن کرتے ہو؟

ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ الْمُنشِـُٔونَ ﴿٧٢﴾

کیا تم اس کا درخت پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟

3283- ﴿الْمُزْنِ﴾ بادل کو کہتے ہیں اور اس کا ایک ٹکڑا مُزْنَةٌ ہے۔ (غ)

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾

ہم نے اسے نصیحت اور مسافروں کے لیے سامان بنایا۔(3284)

ع 2 36 15 فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

سو اپنے رب عظمت والے کے نام کی تسبیح کر۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾

(ایسا) نہیں میں قرآن کے حصوں کے نزول کی قسم کھاتا ہوں۔(3285)

3284- ﴿تَذْكِرَةً﴾ آگ کو قیامت کی آگ یعنی دوزخ کے لحاظ سے کہا۔ اور ﴿لِّلْمُقْوِيْنَ﴾ سے مراد مسافر ہیں [دیکھو نمبر: 3195] اور ابن زید کا قول ہے کہ مُقْوِي زبان عرب میں بھوکے کو کہتے ہیں۔ (ج) اور مسافر کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا کہ وہ زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ ان چاروں موقعوں پر جہاں جہاں سوال کا رنگ ہے آپ پڑھتے تھے [بَلْ اَنْتَ يَا رَبّ]۔

3285- ﴿لَآ﴾ عدم محض کے لیے استعمال ہوتا ہے اور تینوں زمانوں میں اور اسم فاعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور بعض وقت ﴿لَآ﴾ ایک کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور وہ کلام محذوف کی نفی کرتا ہے جیسے ﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ [یونس: 61:10] ''اور تیرے رب سے ذرہ کے وزن کے برابر بھی کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں۔'' اور اسی پر محمول ہے۔ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [القیامة: 1:75] ''نہیں میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔'' ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ﴾ [المعارج: 40:70] ''سو نہیں میں مشرقوں کے رب کی قسم کھاتا ہوں۔'' ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [النسآء: 65:4] ''سو نہیں تیرے رب کی قسم وہ ایمان ہی نہیں لاتے۔'' اور جیسے یہاں اور بعض وقت دو متضاد باتوں پر مکرر لایا جاتا ہے اور دونوں میں اثبات امر مراد ہوتا ہے۔ اور کبھی ان کے درمیان کسی حالت کا اثبات ہوتا ہے مثلاً ﴿لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ [النور: 35:24] جس سے مراد ہے کہ وہ شرقی بھی ہے اور غربی بھی۔ (غ) اور لَوْلَا دو طرح پر آتا ہے کسی چیز کا امتناع اس کے غیر کے وقوع کی وجہ سے ﴿لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ﴾ [السبا: 31:34] ''اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔'' اور دوسرا بمعنی هَلَّا اور اس کے پیچھے فعل آتا ہے جیسے ﴿لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا﴾ [القصص: 47:28] ''کیوں تو نے ہماری طرف رسول نہ بھیجا۔'' (غ)

مواقع النجوم سے مراد:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ کے نزدیک ﴿بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ﴾ سے مراد یہاں قرآن کریم کے نجوم یا ٹکڑوں کا نزول یا وقت نزول ہی ہے۔ (ج) [دیکھو نمبر: 3192] اور روح المعانی میں ہے کہ اس کے بعد ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ لا کر اسے گویا صراحت سے بیان کر دیا ہے کہ ﴿بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ﴾ سے مراد نزول قرآن ہی ہے۔ اور اگر نجوم سے مراد ستارے لیے جائیں

وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾	اور وہ بھاری قسم ہے اگر تم جانو۔
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾	یقیناً یہ قرآن نفع پہنچانے والا ہے۔
فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾	محفوظ کتاب میں۔
لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾	سوائے پاک لوگوں کے اسے کوئی نہ چھوتا۔ (3286)

تو مَوٰقِع سے مراد ان کا غائب ہونا لیا جائے گا۔ اس کے لیے بھی [نمبر: 3192] دیکھو اور بخاری میں ہے کہ ﴿بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ﴾ سے مراد [مُحْكَمُ الْقُرْآنُ] ہے یعنی قرآن شریف کی محکم آیات۔

3286- قرآن کی عزت اور حفاظت: قرآن کے ہر حصہ کے نزول کو بطور شہادت یا قسم پیش کر کے جواب قسم میں تین باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ① یہ قرآن کریم ہے۔ ② یہ محفوظ کتاب میں ہے۔ ③ سوائے پاکوں کے اسے کوئی نہیں چھوتا۔ اب ظاہر ہے کہ جواب قسم وہ ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے اور قسم بجائے شہادت ہے۔ پس قرآن کے ہر حصہ کے نزول کو بطور شہادت پیش کیا ہے کہ یہ قرآن کیا ہے۔ یعنی اندرونی شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پہلی بات قرآن کا کریم ہونا ہے۔ کریم کے لیے [دیکھو نمبر: 647] قرآن کو کریم بلحاظ اس کے معزز اور ممتاز ہونے کے بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ پھر صرف ایک دعویٰ ہوگا۔ کریم جب اللہ تعالیٰ کا وصف ہو تو مراد اس کا احسان و انعام ہوتا ہے۔ پس کلام الٰہی کے کریم ہونے میں بھی اس کے ذریعہ سے احسان و انعام ہی مراد ہے۔ یعنی دنیا کو اس سے نفع پہنچے گا اور قرآن کا نزول اس پر یوں گواہ تھا کہ جو کچھ نازل ہو رہا تھا وہ انسانوں میں ایک روحانی انقلاب پاکیزگی کی طرف پیدا کرتا چلا جاتا تھا۔ [وَ قِيْلَ الْكَرَمُ اَعَمُّ مِنْ كَثْرَةِ الْبَذْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَالْاِتِّصَافِ بِمَا يُحْمَدُ مِنَ الْاَوْصَافِ كَكَثْرَةِ النَّفْعِ] ''اور کہا گیا ہے کہ مہربان ہونا، زیادہ خرچ، نیکی اور ایسی خصلتوں کی طرف نسبت جن سے کسی کی اچھائی بیان ہوتی ہے سے زیادہ عمومیت رکھتا ہے زیادہ نفع کی طرح۔'' (ر) ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ میں یہ معنی لیے گئے ہیں کہ وہ آسمان پر ہونے کی وجہ سے گرد و غبار سے محفوظ ہیں اور شیاطین اسے لے کر نہیں اترے بلکہ ملائکہ لے کر آئے ہیں۔ (ج) یہ دونوں باتیں قرآن شریف کی اس خاص عظمت پر کچھ روشنی نہیں ڈالتیں جس کے ثابت کرنے کے لیے اتنی بڑی قسم کھائی گئی ہے۔ جس طرح قرآن کا کریم ہونا ایک عظیم الشان امر ہے جو پایہ ثبوت کو پہنچ گیا یعنی دنیا بھی اس کی قائل ہوگئی، اسی طرح فی الحقیقت باقی دو امور بھی ایسے ہی عظیم الشان امور ہیں جو قرآن کریم کی خصوصیت کو دیگر کتب پر ثابت کرتے ہیں۔ اور ﴿مَّكْنُوْنٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے حملوں اور منصوبوں سے محفوظ ہے یعنی وہ اسے برباد نہیں کر سکتے اور تغیر و تبدل سے بھی محفوظ ہے۔ [وَ قِيْلَ اَیْ فِيْ كِتَابٍ مَصْنُوْنٍ عَنِ التَّبْدِيْلِ وَالتَّغْيِيْرِ وَ هُوَ الْمُصْحَفُ الَّذِيْ بِاَيْدِي الْمُسْلِمِيْنَ وَ يَتَمَضَّنُ ذٰلِكَ الْاَخْبَارُ بِالْغَيْبِ لِاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ اِذْ ذَّاكَ مَصَاحِفُ] ''اور

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ تو کیا تم اس کلام کو جھوٹا قرار دیتے ہو۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ اور (اسے) اپنا حصہ ٹھہراتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو۔ (3287)

کہا گیا ہے کہ ایسی کتاب میں جو تحریف وتبدیلی سے محفوظ ہے اور وہ مصحف ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ خبر غیب کی خبر ہے۔ کیونکہ اس وقت تو ابھی مصحف نہیں تھے۔'' (ر) اب تیسری بات یہ ہے کہ اسے پاکوں کے سوائے کوئی چھو نہیں سکتا۔ تو اس میں ابن جریر میں ایک قول کے مطابق ملائکہ کے ساتھ رسول اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انہی کی طرح گناہوں سے پاک کیے گئے ہیں۔ اور روح المعانی میں ایک قول ہے کہ ﴿الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ سے مراد کفر سے پاک یعنی مومن ہیں اور ﴿يَمَسُّهٗٓ﴾ سے مراد يَطْلُبُهٗ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوپر جو دو باتیں بیان ہوئی ہیں کہ قرآن پاک کے منافع بہت ہیں جو لوگوں کو اس سے پہنچیں گے اور کہ یہ دشمنوں سے محفوظ ہے، انہی کے ذیل میں یہ تیسری بات ہے کہ اس تک رسائی سوائے پاک لوگوں کے اور کسی کو نہیں ہو سکتی۔ پس دشمن جو نقصان دینے کی نیت سے اس تک پہنچنا چاہتا ہے وہ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسے صرف وہی لوگ چھو سکیں گے جو پاک ہیں۔ اور اس سے دونوں باتیں اخذ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان کو بھی چاہئے کہ قرآن کریم کو طہارت کی حالت میں چھوئے اور دوسرے یہ کہ اس کے مضامین عالیہ تک رسائی انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کریں۔ یہ مطہرین کے قرآن شریف تک پہنچنے کے دو رنگ ہیں۔ ایک ظاہری ایک باطنی۔ قرآن شریف کے ظاہری آداب کا جو شخص پاس کرتا ہے وہی اس کے باطن تک بھی پہنچ سکتا ہے اور یہ حکم مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ کفار کو قرآن شریف پڑھنے کے لیے نہ دیا جائے، کیونکہ اس طرح تبلیغ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور قرآن کے آنے کی اصل غرض ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ البتہ ایک حدیث سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کے ہتک آمیز سلوک سے بچانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ قرآن شریف کو لے کر دشمن کی سرزمین کی طرف سفر نہ کریں۔ بخاری میں ہے: [نَهَى اَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ اِلَى اَرْضِ الْعَدُوِّ] (صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب السَّفَرِ بِالْمَصَاحِفِ اِلَى اَرْضِ الْعَدُوِّ، حديث: 2990)

3287- رِزْقٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 13] نصیب یا حصہ کو کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے۔ (غ) اور اس کے معنی شکر بھی مروی ہیں۔ (ج) اور رَازِقٌ رزق کے خالق اور اس کے عطا کرنے والے اور اس کے مسبب کو کہا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس انسان کو بھی کہا جاتا ہے جو وصول رزق میں سبب بن جاتا ہے۔ ﴿وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ﴾ [الحجر: 20:15] ''اور اس کے لیے (بھی) جسے تم رزق نہیں دیتے۔'' اور رازق صرف اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ﴾ [الذاريات: 58:51] ''اللہ ہی رزق دینے والا ہے۔'' (غ)

فَلَوْ لَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ تو کیوں نہیں ہوتا کہ جب (روح) گلے میں آپہنچتی ہے۔

وَ اَنْتُمْ حِيْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ اور ہم تمہاری نسبت اس سے قریب تر ہیں۔ لیکن تم نہیں دیکھتے۔

فَلَوْ لَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تو کیوں اگر تم کسی کے ماتحت نہیں۔ (3288)

تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ اسے لوٹا نہیں دیتے اگر تم سچے ہو۔

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ پھر اگر وہ مقربوں میں سے ہے۔

فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ تو راحت اور رزق اور نعمت کا باغ ہیں۔

وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ اور اگر وہ برکت والوں میں سے ہے۔

فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ تو تیرے لیے سلامتی ہے (تو) برکت والوں میں سے (ہے)۔ (3289)

3288- ﴿مَدِيْنِيْنَ﴾ [دَانَ النَّاسِ] کے معنی ہیں انہیں مغلوب کیا یا ماتحت کیا۔ اور حدیث ابی طالب میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [أُرِيدُ مِنْ قُرَيْشٍ كَلِمَةٍ تَدِينُ لَهُمْ بِهَا الْعَرَبُ] یعنی میں ان سے ایک بات چاہتا ہوں جس سے عرب ان کے ماتحت ہوجائے اور آنحضرت ﷺ کو ایک شاعر نے [يَا سَيِّدَ النَّاسِ وَدَيَّانَ الْعَرَبْ] (مسند احمد، مسند عبد الله بن عمرو، حديث: 7065) کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اور یہاں ﴿غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ﴾ کے معنی [غَيْرَ مَمْلُوْكِيْنَ] ہیں۔ (ل) اور مَدِيْنٌ غلام کو اور مَدِيْنَةٌ لونڈی کو کہا جاتا ہے۔ (غ)

ان آیات میں بتایا ہے کہ انسان کسی دوسرے کے حکم کے ماتحت ہے۔ اگر وہ خود قادر ہے تو اپنی موت پر کیوں قدرت حاصل نہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [آل عمران: 168:3] ''تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹا رکھو اگر تم سچے ہو۔''

3289- ﴿فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ میں سَلٰمٌ کے معنی بخاری میں مُسَلَّمٌ کیے گئے ہیں یعنی یہ بات مسلم ہے کہ تو اصحاب

وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ اور اگر وہ جھٹلانے والوں گمراہوں میں سے ہے۔

فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ تو کھولتے پانی کی مہمانی ہے۔

وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اور دوزخ میں جلنا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ یہ یقینی سچ ہے۔

ع 3 22 16 فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾ سو اپنے رب عظمت والے کے نام کی تسبیح کر۔

الیمین میں سے ہے اور ابن جریر نے یوں بھی معنی کیے ہیں [فَسَلٰمٌ لَّكَ اَنْتَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ] یعنی اسے یوں کہا جائے گا کہ تیرے لیے سلامتی ہے تو اصحاب الیمین میں سے ہے۔

سورۃ الحدید

نام:

اس سورت کا نام اَلْحَدِيْدِ ہے اور اس میں 4 رکوع اور 29 آیتیں ہیں۔ اس کا نام اَلْحَدِيْدِ اس ذکر سے لیا گیا ہے کہ جب لوگ حق کو نیست و نابود کرنے پر تل جاتے ہیں تو پھر انبیاء کو بھی تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ ورنہ یہ ان کے آنے کی اصل غرض نہیں ہوتی۔ اسی لحاظ سے اس سورت میں اول اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کی وسعت کا ذکر ہے، پھر مسلمانوں کو انفاق کی طرف توجہ دلائی ہے، پھر منافقوں کا ذکر کیا ہے جو نصرتِ دین میں شامل نہیں ہوتے۔ اور مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی ہے کہ لمبا زمانہ گزر جانے پر ان کے دل پہلے اہل کتاب کی طرح سخت نہ ہو جائیں۔ پھر بتایا کہ دنیوی زندگی کو غرض بنانے کا نتیجہ دکھ ہے اور آخر پر رسولوں کے ارسال کے قانون کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ حق کے قائم رکھنے کے لیے تلوار کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ اور سب سے آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کا ذکر کیا۔

یہ سورت مدنی ہے اور اس کا نزول صلح حدیبیہ کے بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں ان لوگوں کی فضیلت کا ذکر ہے جو ﴿مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ﴾ اپنے اموال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے اس کے صدر کو مکی کہا ہے، مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اور تعلق اس کا پہلی سورت کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ وہاں جن اچھے لوگوں کا ذکر تھا وہ دین الٰہی کی نصرت کرنے والا گروہ ہے اور جو لوگ نصرت دین الٰہی نہیں کرتے ان کا حشر گویا کفار کے ساتھ ہے اور یہاں سے سورۂ تحریم تک دس سورتیں مدنی ہیں سورۂ احزاب کے بعد جو مکی سورتوں کا سلسلہ چلا تھا اور اس میں صرف تین سورتیں مدنی درمیان میں ایک خاص تعلق کے لیے لائی گئی تھیں۔ یعنی مُحَمَّدٌ۔ اَلْفَتْحٌ۔ اَلْحُجُرَاتُ، اسے یہاں بند کر کے مدنی سورتوں کے مجموعہ کی اس سب سے پہلی سورت میں کچھ ذکر منافقین کا اور بطور اشارہ ذکر مخالفین کا ہے۔

اٰیَاتُهَا 29 (57) سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ (94) رُكُوْعَاتُهَا 4

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

اللہ کی تسبیح کرتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ②

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③

وہ (سب سے) پہلے اور (سب سے) پیچھے اور (سب سے) ظاہر اور (سب سے) مخفی ہے اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔(3290)

3290- ﴿اَلْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ﴾ حدیث میں ایک دعا کی ذیل میں زبان نبوی سے ان صفات باری کی حسب ذیل تفسیر موجود ہے:[أَنْتَ الأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُونَكَ شَيْءٌ] (صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة، باب: مَا يَقُولُ عِنْدَ النَّوْمِ وَأَخْذِ الْمَضْجَعِ، حديث: 7064) اور یہ مسلم اور ترمذی کی حدیث ہے۔ یعنی تو **اَوَّلْ** ہے تجھ سے پہلے کوئی نہیں اور تو **آخِرْ** ہے تجھ سے پیچھے کوئی نہیں (یعنی سب مخلوق کے فنا کے بعد باقی رہنے والا) اور تو **ظَاهِرْ** ہے تجھ سے اوپر کوئی نہیں اور تو **بَاطِنْ** ہے تجھ سے دون کوئی نہیں اور ان آخری دو فقروں کی تشریح پھر دو طرح پر کی گئی ہے۔ یعنی **ظَاهِرْ** کے ایک یہ معنی کہ تو غالب ہے تجھ پر کوئی غالب نہیں اور دوسرے یہ کہ تو سب چیزوں سے زیادہ ظاہر ہے، ظہور میں تجھ سے اوپر کوئی نہیں۔ کیونکہ ہر چیز کا ظہور تجھ سے ہے اور **بَاطِنْ** کے ایک یہ معنی کہ تیرے سوائے کوئی ملجا اور کوئی **مُنَجّٰا** نہیں جس کی طرف التجا لے جائی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ تو سب چیزوں سے زیادہ **بَاطِنْ** ہے اور ہر چیز کی حقیقت کو اس کا غیر جانتا ہے۔ یعنی خود اللہ تعالیٰ اور تیری حقیقت کو تیرا غیر نہیں جانتا یا ہر چیز کی حقیقت کی معرفت ممکن ہے لیکن تیری ذات کی حقیقت کی معرفت ممکن نہیں۔ اور تیسرے معنی باطن کے یوں بھی کیے گئے ہیں کہ تجھ سے قریب تک کوئی نہیں [وَالْبَاطِنُ اَقْرَبُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ] (ر) اور مفردات میں ہے کہ ظاہر سے اشارہ ہماری بدیہی معرفت کی طرف ہے کیونکہ فطرت جس چیز کی طرف دیکھتی ہے یہی فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ اور باطن سے اشارہ ہماری حقیقی معرفت کی طرف ہے جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے [يَامَنْ غَايَةِ

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۴

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر قائم ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔ اللہ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے اور اللہ کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ؕ وَ هُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور وہ دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ۝۷

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس سے خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں (اپنا) نائب بنایا ہے۔ سو جو لوگ تم میں سے ایمان لاتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ (3291)

مَعْرِفَتِهِ الْقُصُوْرِ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ] یا اپنی آیات سے ظاہر اور اپنی ذات میں باطن یا ظاہر اس لحاظ سے کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور باطن اس لحاظ سے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جاتا۔ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ [الأنعام: 103:6] ''نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔'' (غ)

3291- گویا حقیقی مالک ان اموال کا اللہ تعالیٰ ہے اور انسان صرف بطور نائب یا امین ہے۔ پس اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸

اور تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور رسول تمہیں بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور وہ تمہارا عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو۔ (3292)

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹

وہی ہے جو اپنے بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تمہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالے اور اللہ تم پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ ع 1 10 17

اور تمہارا کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کا ورثہ ہے۔ تم میں سے وہ برابر نہیں جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی (جس نے پیچھے کیا) یہ مرتبہ میں ان سے بڑھ کر ہیں جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑائی کی اور ہر ایک کے ساتھ اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ (3293)

3292- یہاں کفار کو خطاب لے کر میثاق سے مراد دلائل عقلی یا عہد ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ [الأعراف: 172:7] ''کیا میں تمہارا رب نہیں؟'' لیا گیا ہے، مگر اصل مخاطب یہاں ایمان لانے والے ہیں۔ جیسا کہ [آیت :10] سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اور ایمان سے مراد یہاں بات کا مان لینا یا ایمان کامل ہے اور مِيْثَاقٌ سے مراد اقرار زبانی جو اسلام لا کر کیا۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ میں بھی اسے صاف کر دیا ہے اور یہ تنبیہ منافقوں کو ہے۔

3293- ﴿الْفَتْحِ﴾ سے مراد مجاہد اور قتادہ کے نزدیک فتح مکہ ہے اور عامر نے اسے فتح حدیبیہ کہا ہے اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس آیت کو فتح حدیبیہ کے متعلق ہی بیان فرمایا ہے اور قرآن کریم نے بھی اپنے کھلے الفاظ میں حدیبیہ کو ہی فتح مبین کہا ہے۔ اس لیے اسی قول کو ترجیح ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۱﴾

کون ہے جو اللہ کے لیے اچھا مال الگ کرے تو وہ اسے اس کے لیے بڑھاتا ہے اور اس کے لیے عزت والا بدلہ ہے۔

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا ان کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوگا اور ان کے دائیں، آج تمہارے لیے خوشخبری ہے۔ باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہیں میں رہو گے۔ یہی بھاری کامیابی ہے۔ (3294)

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں سے کہیں گے ہمارا انتظار کرو، ہم بھی تمہارے نور سے (روشنی) لیں۔ کہا جائے گا اپنے پیچھے کو لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو۔ پس ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ اس کا ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر کی طرف رحمت ہے اور اس کے باہر کی جہت سے عذاب ہے۔ (3295)

3294- **مومنوں کو نور کس طرح مل سکتا ہے؟:** ابن جریر میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ نور آگے اور دائیں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ ان کا ایمان ان کے آگے ہوگا اور ان کی کتاب ان کے دائیں ہاتھ میں اور یہ ضحاک کا قول ہے، اور ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اعمال کی جزا تو اعمال کے مطابق ہے۔ جس شخص کی یہاں یہ حالت ہے کہ اس کا نور ایمان اس کے آگے آگے ہے اور کتاب دائیں ہاتھ میں یعنی اس پر مضبوط ہو کر عمل کرتا ہے وہی ایمان اور کتاب اس کے لیے قیامت کے دن نور بن جاتے ہیں اور فی الحقیقت نور یہیں سے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ ﴿یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرة: 257:2] ''ان کو سخت اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔'' اور دائیں ہاتھ ہونے سے یہ مراد نہیں کہ باقی طرفوں میں ظلمت ہوگی، بلکہ آگے بڑھنے اور یمن کے لحاظ سے ان دو طرفوں کا نام لیا ہے اور جس کے دو جانب نور ہوگا، اس کے چاروں طرف روشنی ہوگی۔ ظلمت اس کے کسی طرف بھی نہیں ہو سکتی۔

3295- **اعمال اور جزا کا تعلق:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق ظلمت میں ہوں گے۔ روایات میں ہے کہ پہلے انہیں نور دیا جائے گا

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾

انہیں پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ کہیں گے ہاں، لیکن تم نے اپنی جانوں کو فتنے میں ڈالا اور انتظار کرتے رہے اور شک میں پڑے رہے۔ اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آگیا۔ اور بڑے دھوکے باز نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں رکھا۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

سو آج تم سے فدیہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ان سے جنہوں نے کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانا آگ ہے، وہی تمہاری رفیق ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ (3296)

لیکن جب صراط پر جائیں گے تو بجھا دیا جائے گا یہ بھی ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾﴾ [النبأ: 26:78] ''بدلہ موافق (اعمال ہے)۔'' کا رنگ ہے۔ وہ پہلے ایمان لائے مگر صراط مستقیم پر نہ چلے ویسا ہی معاملہ ان سے قیامت میں ہوگا۔ اور ان کا مومنوں سے نور مانگنا اور مومنوں کا جواب سب ان کے انہی اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ﴾ یعنی یہ نور تو بذریعہ اعمال دنیا میں ہی مل سکتا تھا اور درمیان میں دیوار کا حائل ہوجانا یا روک کا یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ ان کا تعلق باہم منقطع ہوجائے گا، جس طرح دنیا میں انہوں نے منقطع کر دیا تھا اور اس دیوار میں دروازہ بتاتا ہے کہ اس دروازہ سے وہ آخر کار داخل ہوجائیں گے مگر جب تک کہ اپنے اعمال کی پاداش نہ حاصل کرلیں اس وقت تک نہیں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت اور نار میں فرق بھی صرف ایک دیوار کا ہے۔ حالانکہ ایک اعلیٰ علیین پر ہے اور دوسرا اسفل السافلین میں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے بیان میں ظاہری بلندی اور پستی مراد نہیں۔ ایک ہی دیوار درمیان میں ہے، ادھر عذاب اُدھر رحمت۔ اور یہ وہی دیوار ہے جسے انسان اپنے اعمال سے کھڑا کرلیتا ہے۔ پھر ایک دفعہ اسے نور کہا تو دوسری دفعہ اسے رحمت اور جنت قرار دیا اور جسے پہلے ظلمت قرار دیا اسی کو بعد میں عذاب جہنم سے تعبیر کیا۔

3296- آگ یا دوزخ کو یہاں کفار اور منافقین کا مولیٰ یا مددگار کہا ہے اور اس طرح صاف بتادیا کہ دوزخ ان کے لیے بطور علاج ہے۔ گو ایک ایسا علاج ہے جو ان کے لیے دکھ کا موجب ہے، مگر وہ اس قابل نہیں رہے کہ جب تک آگ کے ذریعہ سے ان کی آلائشوں کو صاف نہ کیا جائے وہ جنت میں یا خدائے قدوس کے حضور میں حاضر ہوسکیں۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ لَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جائیں؟ اور اس کے (لیے) جو حق سے اترا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔ (3297)

اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾

جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔ ہم نے تمہارے لیے آیتیں کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ

صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور (جو)

3297- **مسلمانوں کی آئندہ حالت کا نقشہ:** مقاتل اور کلبی نے اس آیت کو منافقین کے متعلق سمجھا ہے، مگر یہ صحیح نہیں۔ (ر) اور ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ مکہ کی تکلیفات کے بعد مدینہ میں صحابہ کو کچھ آسودگی میسر آ گئی تھی، اس لیے اس آیت کا نزول ہوا۔ (ر) اور یہ بالبداہت غلط ہے، مدینہ میں آ کر مکہ سے زیادہ تکلیفات کا شکار انہیں ہونا پڑا۔ اس کے بالمقابل ابن جریر نے قتادہ کی روایت بیان کی ہے جس میں شداد بن اوس کا قول ہے [أَوَّلُ مَا يَرْفَعُ مِنَ النَّاسِ الْخُشُوْعُ] (کنزالعمال، جلد3، صفحہ 144) سب سے پہلے لوگوں سے خشوع اٹھایا جائے گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس آیت کو آئندہ زمانہ پر لگایا، جب لوگوں کے درمیان سے خشوع اٹھ جائے گا۔ اور قرآن کریم کے کھلے الفاظ اسی نتیجہ کے مؤید ہیں۔ اس لیے کہ ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ﴾ یہاں کا ذکر اہل کتاب کے متعلق ہے یعنی ان کے دل ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد سخت ہوئے تھے، تو اسی حالت سے مسلمانوں کو ڈرایا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی لمبا زمانہ گزر جائے تو تمہارے دل سخت ہو جائیں۔ اور ﴿اَلَمْ يَاْنِ﴾ میں کچھ مصائب کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اس قدر مصائب اور تکالیف کو اٹھا کر بھی تمہیں سمجھ آئے گا یا نہیں کہ پہلی ضرورت ذکر اللہ اور قرآن کے آگے اپنے آپ کو جھکانا ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جس کی طرف آج مسلمانوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾

اللہ کے لیے اچھا مال الگ کرتے ہیں ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے عزت والا اجر ہے۔ (3298)

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١٩﴾ ع 2 9 18

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں، ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔ اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اور ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ دوزخ والے ہیں۔ (3299)

اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ

جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشہ اور زینت اور آپس میں فخر کرنا اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے پر کثرت چاہنا ہے۔ بارش کی مثال کی طرح جس کا سبزہ کسانوں کو

3298- ﴿الْمُصَّدِّقِيْنَ﴾ مُصَّدِّقٌ اصل میں مُتَصَدِّقٌ ہے یعنی صدقہ دینے والا۔ خدا کی راہ میں دینے کو مشکلات کا علاج بتایا ہے۔

3299- دین کے لیے بھاگنے والوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونا: ﴿اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ﴾ سے مراد یہاں کامل الایمان لوگ ہیں جو دین کے مقابل پر کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [مَنْ فَرَّ بِدِيْنِهِ مِنْ أَرْضٍ إِلٰى أَرْضٍ مَخَافَةَ الْفِتْنَةِ عَلٰى نَفْسِهِ وَدِيْنِهِ كُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا فَإِذَا مَاتَ قَبَضَهُ اللّٰهُ شَهِيْدًا وَّتَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ ثُمَّ قَالَ هٰذِهِ فِيْهِمْ ثُمَّ قَالَ : الْفِرَارُوْنَ بِدِيْنِهِمْ مِنْ أَرْضٍ إِلٰى أَرْضٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِيْ دَرَجَتِهِ فِي الْجَنَّةِ] (روح المعانی، جزء 27) یعنی جو شخص اپنے نفس اور دین پر فتنہ کے خوف سے اپنے دین کو لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھاگتا ہے وہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھا جاتا ہے اور جب مرتا ہے تو اللہ اسے شہید کے طور پر قبض کرتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ﴾ اور فرمایا یہ انہی کے بارہ میں ہے۔ پھر فرمایا اور اپنے دین کو لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف بھاگنے والے قیامت کے دن عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ان کے جنت کے درجہ میں ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنے دین کو لے کر ملک شام سے بھاگ گئے تھے۔

اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰

خوش لگتا ہے۔ پھر وہ خشک ہوجاتا ہے تو اسے زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہوجاتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضا۔ اور دنیا کی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے۔ (3300)

سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱

اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو اور اس جنت کی طرف جس کی فراخی آسمان اور زمین کی فراخی کی طرح ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) بڑے فضل والا ہے۔

3300- ﴿تَكَاثُرٌ﴾ كَثْرَةٌ اور قِلَّةٌ کا استعمال کمیت منفصلہ مثلاً اعداد وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اور ﴿فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ﴾ [الزخرف: 73:43] ''بہت پھل ہیں۔'' میں صرف کثرت عدد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ فضیلت کی طرف بھی۔ اور مَكَاثَرَةٌ اور تَكَاثُرٌ کثرت مال اور عزت میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش ہے ﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱﴾ [التکاثر: 1:102] ''کثرت مال کی خواہش نے تمہیں غافل کر رکھا ہے۔'' اور ﴿اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱﴾ [الکوثر: 1:108] ''ہم نے تجھے کوثر دی ہے۔'' میں کہا گیا ہے کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے جس سے نہریں نکلتی ہیں اور کہا گیا ہے بلکہ وہ خیر کثیر ہے جو نبی ﷺ کو دی گئی اور سخی آدمی کو بھی كَوْثَرٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) اور اِسْتِكْثَارٌ اپنے لیے کسی چیز کی کثرت چاہنا ہے۔ ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶﴾ [المدثر: 6:74] ''اور اس لیے احسان نہ کر کہ زیادہ ملے۔''

یہ دنیا کی زندگی کو غرض بنا لینے کے نتائج ہیں۔ اس لیے آخر پر فرمایا کہ آخرت میں سخت عذاب ہے کیونکہ یہاں آخرت کے لیے کوئی تیاری نہیں کی اور اس کے مقابل پر مغفرت اور رضا کا ذکر کیا کہ یہ اس کے لیے ہے جو آخرت کو غرض بناتا ہے۔ آج ان الفاظ کو بالخصوص سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب چاروں طرف یہی لہو ولعب اور تفاخر اور تکاثر کا نظارہ نظر آتا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾

کوئی مصیبت زمین پر نہیں پہنچتی ہے اور نہ تمہاری اپنی جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں ہوتی ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ (3301)

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ﴿۲۳﴾

تاکہ تم اس پر غم نہ کھاؤ جو تم سے جاتا رہا اور نہ اس پر اتراؤ جو تمہیں دیا ہے۔ اور اللہ کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور وہ پھر جاتا ہے، تو اللہ بے نیاز ہے تعریف کیا گیا۔

3301- آخری زمانہ میں مصائب اہل اسلام: کتاب سے مراد علم الٰہی ہے اور ﴿نَّبْرَاَهَا﴾ کی ضمیر مصیبت کی طرف جاتی ہے اور ہر مصیبت کے کتاب میں ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ بعض اسباب کا نتیجہ ہے۔ ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور ﴿فِي الْاَرْضِ﴾ سے مراد قحط زلزلے وغیرہ لیے گئے ہیں اور ﴿فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے مراد بیماریاں وغیرہ۔ مگر ہوسکتا ہے کہ یہاں خطاب مسلمانوں کو ہے اور مراد ﴿فِي الْاَرْضِ﴾ سے دنیا کی اور قوموں کی مصائب ہیں اور ﴿فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے مسلمانوں کی مصائب۔ اور دیلمی میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [سَيُفْتَحُ عَلٰى أُمَّتِيْ بَابٍ مِّنَ الْقَدْرِ فِي آخِرِ الزَّمَانِ لَا يَسُدُّهُ شَيْءٌ يَكْفِيْكُمْ مِنْهُ أَنْ تَلْقَوْهُ بِهٰذِهِ الْآيَةِ](كنزالعمال، باب: الايمان بالقدر من الاكمال، حديث: 609) (ر) یعنی میری امت پر ایک مصائب کا دروازہ آخری زمانہ میں کھولا جائے گا، اسے کوئی چیز نہیں روک سکے گی۔ تمہارے لیے کافی ہوگا کہ اس آیت ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ﴾ سے اس کا مقابلہ کرو۔ جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ آیت آخری زمانہ کے متعلق ایک پیشگوئی اپنے اندر رکھتی ہے اور فی الحقیقت آج کے مسلمانوں کے مصائب مفصل احادیث نبوی میں موجود ہیں اور اس آیت میں تسلی ہے۔

شگون لینا جائز نہیں:

اور امام احمد کی حدیث میں ہے کہ دو شخص سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئے اور عرض کیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے کہ عورت اور چار پائے اور گھر میں شگون ہے، تو انہوں نے کہا یہ نہیں بلکہ آپ یوں فرمایا کرتے تھے کہ اہل

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ ع 3 6 19

ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں شدت کی سختی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں مدد کرتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) قوت والا غالب ہے۔ (3302)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور ہم نے ہی نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو رکھا۔ سو ان میں سے کچھ ہدایت پر ہیں اور بہت سے ان میں نافرمان ہیں۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ

پھر ہم نے ان کے قدموں پر ان کے پیچھے (اور) رسول بھیجے اور (سب سے) پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور اسے

جاہلیت کہا کرتے تھے کہ ان چیزوں میں شگون ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی۔

3302- ﴿اَلْمِيْزَانَ﴾ سے مراد یہاں عدل ہے۔ (ج) رسولوں کے ساتھ کتاب بھیجی جس میں احکام اور شرائع ہیں اور ان کے ساتھ عدل کو نازل کیا۔ یعنی اس کتاب کو ٹھیک طور پر استعمال کرنے کا طریق دونوں کی غرض بتائی کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اگر صرف احکام ہوتے یعنی کتاب اور اس کے ساتھ میزان نہ ہوتی تو بھی لوگ اس پر عمل نہ کر سکتے۔ اس لیے کہ انہیں علم نہ ہوتا کہ کس حکم پر کس حد تک اور کن حالات میں عملدرآمد کرنا ہے۔ رسول کا اس پر عمل کر کے دکھانا گویا ایک میزان قائم کر دینا ہے۔ پس میزان کا اصل میں رسول نمونہ ہے اور اس کے ساتھ لوہے کا ذکر کیا، یعنی لوگ اس کی مخالفت کرتے اور تلوار سے اسے نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ یہی منشا ہے ﴿لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ﴾ (غ) کا۔ اور اس نصرت کو جو مومن ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کے دین کی کرتے ہیں ﴿بِالْغَيْبِ﴾ اس لیے کہا کہ اس وقت تو غلبہ کفر کا ہی ہوتا ہے اور حق کی کامیابی محض ایک ایمانی بات ہوتی ہے اور لوہے کے اتارنے کا یہ منشا نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کچھ اوزار نازل ہوئے تھے، بلکہ زمین میں لوہے کا پیدا کرنا مراد ہے۔

جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۟ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

انجیل دی۔ اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی مہربانی اور رحم ڈالا۔ اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی، ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا۔ مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے (نکالی)۔ پر اس کی وہ نگہداشت نہ کر سکے جو اس کی نگہداشت کا حق تھا۔ سو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کا اجر دیا۔ اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں۔ (3303)

3303- **بدعت** رہبانیت: ﴿عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ﴾ میں ضمیر نوح اور ابراہیم علیہما السلام کی طرف ہی ہے اور تثنیہ کی بجائے جمع ضمیر لانے میں اشارہ دیگر ان کے ہمعصر رسولوں کی طرف ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ لوط علیہ السلام تھے۔ اور ﴿قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ لا کر بتا دیا کہ ان تمام رسولوں کا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر خاتمہ کر دیا۔ گویا یوں فرمایا کہ رسول کے بعد رسول بھیجتے رہے یہاں تک کہ عیسیٰ پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے پیروؤں کے دلوں میں مہربانی اور رحم کا خصوصیت سے ذکر کیا (اور یوں صحابہ کی صفت میں بھی ہے ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: 29:48] ''آپس میں رحم کرنے والے۔'') اس لیے کہ ان کی تعلیم میں صرف اس ایک پہلو پر ہی زور تھا۔ گویا ان کی تعلیم صرف ایک شاخ قوائے انسانی کی پرورش کے لیے تھی۔ اور یوں بتا دیا کہ یہ سب مقامی اور وقتی تعلیمات تھیں۔ اور پھر ان کی رہبانیت کا ذکر کیا جو انہوں نے بطور بدعت اختیار کر لی یعنی نرمی اور محبت کی تعلیم تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے مگر یہ کبھی اس نے کسی قوم کو تعلیم نہیں دی کہ علائق دنیوی سے بکلی منقطع ہو کر عبادت میں مصروف ہو جائیں۔ اور ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ میں اِلَّا استثنائے منقطع ہے، یعنی یہ بدعت حصول رضائے الٰہی کے لیے تھی۔ مسلمانوں نے بھی اس قسم کی بہت سی بدعات نکالی ہیں جیسے مختلف قسم کے اذکار اور چلّے پہلے جن کا کتاب وسنت میں کوئی نام ونشان نہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ کے عمل میں ان کا پتہ ملتا ہے۔ مگر ان کی غرض بھی تزکیہ نفس ہی تھی اور ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ میں بتایا کہ ایسی باتیں جو لوگ ایجاد کر لیتے ہیں تو پھر ان پر قائم نہیں رہ سکتے اور انجام کار ان کا نقصان بہ نسبت ان کے نفع کے بڑھ جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگ ان سے فائدہ اٹھا کر ﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ﴾ کا مصداق ہوتے ہیں تو کثیر حصہ فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رہبانیت کا انجام بھی یہی ہوا کہ ایک طرف تو خود رہبانیت اختیار کرنے والے گو چند آدمی زہد وعبادت میں ترقی کر گئے مگر کثیر حصہ اسی رہبانیت کی وجہ سے خطرناک فسق وفجور میں مبتلا ہوا جس کا اعتراف خود عیسائیوں کو ہے۔ اور دوسری طرف کثیر حصہ جو دنیوی مشاغل کو ترک نہیں کر سکتا تھا ان کی زندگیوں میں مذہب برائے نام باقی رہ گیا اور وہ بھی فسق وفجور میں مبتلا ہو گئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے دے اور تمہارے لیے نور پیدا کر دے جس سے تم چلو اور تمہاری مغفرت کرے۔ اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (3304)

اسلام میں بدعت کیا ہے؟:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدعت گو حصول رضائے الٰہی کے لیے ہی ہو مگر نتیجہ اس کا اچھا نہیں ہو سکتا۔ اور بدعت محض ہر ایک ایسے کام کا نام نہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہ کیا ہو، بلکہ کسی ایسی بات یا ایسی رسم کو دین کا جزو قرار دینا ہے جو کتاب یا سنت نبوی سے ثابت نہ ہو۔ مثلاً بعض بزرگوں نے بدعت کی تعریف کو وسعت دیتے ہوئے رد ملاحدہ وغیرہ کو اور تصنیف کتب علم اور بنائے مدارس کو بھی بدعت میں داخل کیا ہے اور پھر اسے بدعت کی واجب اور مندوب قسم قرار دیا ہے۔ اور بعض نے مختلف اقسام کے کھانوں یا لباس کو بدعت قرار دے کر پھر اسے بدعت کی قسم مباح قرار دیا ہے۔ ایسا ہی بعض لوگ خطبہ جمعہ میں سامعین کی زبان میں وعظ کرنے کو بدعت سمجھتے ہیں۔ اب باطل کا رد کرنا خواہ کسی جائز طریق پر ہو نہ صرف بدعت نہیں بلکہ اولین فرض ہر مسلم کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود ساری عمر رد باطل کرتے رہے اور اس رد کرنے میں کوئی تقریر کرے یا کتاب لکھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ایسا ہی خطبہ جمعہ میں وعظ رسول اللہ ﷺ کرتے تھے اور اس کی غرض سامعین کو فائدہ پہنچانا تھا۔ اب اگر کوئی خطیب عربی زبان میں خطبہ پڑھ چھوڑتا ہے تو وہ خطبہ کی اصل غرض سے بے خبر ہے اور خطبہ کا حق وہی ادا کرتا ہے جو سامعین کو وعظ سناتا ہے اور اس کے لیے ان کی زبان میں تقریر کرنا ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ کوئی شخص کون سا کھاتا ہے یا کس طرح کھاتا ہے یا کون سا لباس پہنتا ہے یا کس مکان میں رہتا ہے ان پر بدعات کا نام نہیں آ سکتا۔ اور [وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ] (صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب: تَخْفِيفِ الصَّلَاةِ وَالْخُطْبَةِ، حديث: 2042) کا ارشاد صحیح ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نماز تراویح کے متعلق [نِعْمَةُ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ] بطور فرض معلوم ہوتا ہے۔ یعنی تم اگر اسے بدعت کہو تو یہ اچھی بدعت ہے۔ کیونکہ صلوٰۃ التراویح کا اصل برنگ تہجد شریعت میں موجود ہے۔ اور یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں نماز تہجد کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ اس لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی اہمیت کی خاطر اسے اول شب میں کر دیا تا کہ جو لوگ پچھلے وقت نماز کے لیے اٹھ نہیں سکتے وہ بالکل محروم نہ رہ جائیں۔ اور اس کی ایک نظیر خود وتروں میں موجود ہے جو حالانکہ اصل میں نماز تہجد کا ہی حصہ ہے، مگر عام لوگوں کی خاطر اسے اول شب میں رکھ دیا گیا۔ اور اس کا اول شب میں رکھنا خود رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے۔ پس نماز تراویح بدعت نہیں، البتہ افضل یہی ہے کہ رمضان میں نماز تہجد کا خاص تعاہد کیا جائے۔

3304- ﴿كِفْلَيْنِ﴾ سے مراد کفل دنیا اور کفل آخرت ہیں۔ چونکہ اوپر عیسائیوں کا ذکر تھا جنہوں نے رہبانیت اختیار کی، تو یہاں بتایا

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع 4/4 20

تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھیں کہ وہ (مسلمان) اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر دسترس نہیں رکھتے اور فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) بڑے فضل والا ہے۔ (3305)

کہ مسلمان اگر تعلیم قرآن پر چلیں تو وہ دین و دنیا دونوں کو اپنے اندر جمع کر لیں گے۔ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ [البقرة: 201:2] ''اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں (بھی) بھلائی (دے)۔''

3305- ﴿لِئَلَّا﴾ یہاں لِكَيْ کے معنی میں ہے۔ کیونکہ عرب ہر کلام میں لَا کو بطور صلہ داخل کرتے ہیں جس کے اول اور آخر میں انکار ہو اور غرض اس کی تصریح ہوتی ہے۔ جیسے ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ [الأعراف: 12:7] ''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا۔'' ﴿وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾﴾ [الأنبيآء: 95:21] ''اور اس بستی پر جسے ہم ہلاک کر دیں، لازم ہے کہ وہ لوٹ کر نہ آئیں۔'' (ج)